فکر و نظر

ڈاکٹر پریمی رومانی

تقسیم کار

رچنا پبلی کیشنز

تپسیا، ۳/ انصیب نگر۔ جانی پور جموں ۱۸۰۰۰۷ (توی)

تپسیا۳/انصیب نگر۔ جانی پور جموں ۱۸۰۰۰۷(توی)

سن اشاعت : ۲۰۱۲ء

نام کتاب : فکر ونظر

مصنف : ڈاکٹر پریمی رومانی

کمپوزنگ : مسعود احمد جموں 9906063200

مطبع : تاج پرنٹنگ سروس، دہلی فون نمبر:9871285181

قیمت : -/450 روپئے

FIKR-O- NAZAR
(Criticism & Research)
By Dr. Premi Romani

2012
Price: Rs.450/-

تقسیم کار

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ ممبئی 400008
- کتاب دار، جلال منزل نزد جے جے ہسپتال ممبئی 400008
- پاک بک چینل، پکہ ڈنگا جموں (توی)
- رچنا پبلی کیشنز ۳/ا نصیب نگر جانی پور جموں (توی)

انتساب

پروفیسر سُکھ چین سنگھ
کے نام
جن کی شرافت، علم دوستی اور متانت
کا میں قائل ہوں۔

ڈاکٹر پریمی رومانی

ترتیب

میری بات

''فکر ونظر'' میرا تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔

اس میں شامل مقالات اُردو ادب کی مختلف جہات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ مقالات اگر چہ مختلف اوقات پر لکھے گئے ہیں لیکن میں نے ان میں تسلسل قائم رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوگیا ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ ہی کرسکتے ہیں۔ کیونکہ میں قارئین کی رائے کا ہمیشہ احترام کرتا آیا ہوں۔

''فکر ونظر'' کے بعض مقالات شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام منعقد کئے گئے نیشنل سیمیناروں میں پیش کئے گئے ہیں اور بعض مقالات ہندو پاک کے معتبر رسائل واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی ادبی دنیا میں خوب پذیرائی ہوئی ہے۔

فیض احمد فیض پر جو مقالہ اس کتاب میں شامل ہے۔ وہ اس لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے کہ اس میں فیض کے بعض شخصی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری کی مختلف جہات کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے نیز علامہ اقبال کے ساتھ اُن کے تعلقات کا بھی ایک عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

سعادت حسن منٹو پر میرا مقالہ بھی اسی نوعیت کا ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اُردو

زبان نئی دہلی کے موقر رسالے سہ ماہی فکر و تحقیق کے منٹو نمبر میں شائع ہو چکا ہے اور علمی وادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا ہے۔

اختر الایمان کے خطوط کے عنوان سے جو مقالہ اس کتاب میں شامل ہے وہ بھی انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔ اختر مرحوم سے بعض یادگار ملاقاتیں میری یادوں کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں وہ ہمیشہ میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھتے تھے۔ مجھے بھی ان کی باوقار شخصیت کا بڑا احترام تھا۔ یہ مقالہ ان کے ساتھ گذرے ہوئے لمحات کی یادگار ہے۔

فکر و نظر میں بعض نئی مطبوعات پر تبصرے بھی شامل کئے گئے ہیں جو ملک کے مقتدر ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ نئے قلم کاروں کی کتابوں پر محیط ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ ان تبصروں کا بھی بغور جائزہ لینے کی زحمت کریں گے۔

بہر حال فکر و نظر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی زحمت کریں گے اور مجھے اپنی قیمتی رائے سے نوازیں گے۔

ڈاکٹر پریمی رومانی
۳/ انصیب نگر جانی پور جموں
۱۸۰۰۰۷

۲۲ر ستمبر ۲۰۱۲ء

اقبال کی فکر

اِقبال کم سنی میں ہی شعروشاعری کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔اُس زمانے میں داغؔ کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔اقبالؔ اس شہرت سے متاثر ہوئے۔وہ خط وکتابت کے ذریعے اُن سے اصلاح لینے لگے اور زبان وبیان کے رموز سیکھے لیکن اس رشتے کے باوصف اقبالؔ، داغؔ کے شاعرانہ آہنگ اور اُن کے موضوعات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے اور بہت جلد اُنہوں نے اپنی راہ متعین کرلی۔اقبالؔ کا رجحان طبع شروع سے ہی تفکر کی طرف تھا۔یہی وجہ ہے کہ داغؔ کا تلمذ اختیار کرنے کے باوصف اقبالؔ اپنے پیش رووں میں غالبؔ کے فکرونظر سے روشنی حاصل کرتے رہے اور یہی وہ چنگاری تھی جس نے اقبال کو آنے والے برسوں میں برگساںؔ، کانٹ، ہیگل، مارکسؔ، فختے، نٹشے اور دوسرے فلسفیوں کی فکر کا مطالعہ کرنے اور اُن سے فیض حاصل کرنے پر اُکسایا۔اس سے خود اُن کی فکرونظر کے سوتے اُبل پڑے اور جذبے اور احساس کی صداقت کی آمیزش سے اُنہوں نے ان میں سے بیشتر چیزوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔خیالات کے اس جلوہ صدرنگ میں سب سے نمایاں رنگ مولانا روم نے عطا کیا جن

کو اقبالؔ نے ہمیشہ اپنا رُوحانی مُرشد تصور کیا۔ یہ رومیؔ کے افکار کا نتیجہ تھا جس نے اقبالؔ کی شاعری کو عمل، حرکت اور خودشناسی کا جوہر عطا کیا۔ اقبالؔ کی شاعری ان ہی سب اجزاء سے متشکل ہوئی ہے۔

اقبال کی شاعری اپنے ارتقائی سفر میں کئی منزلوں سے گزری۔ ابتداء میں داغؔ کی شاگردی کے دوران غزل کا روایتی انداز اختیار کیا اور زبان و بیان کی پاکیزگی کے ساتھ شعر گوئی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران وہ وطنیت کے جذبے سے سرشار تھے۔ اس جذبے کا اظہار ایک نئے انداز میں اُنہوں نے کیا۔ حتیٰ کہ وہ وطن پرستی کے محدود تصور کو بلند آہنگ میں نظم کے ذریعے سے ظاہر کرنے لگے لیکن اس دور میں بھی اُن کے یہاں مسلمانوں کی ذہنی اور رُوحانی بدحالی کا احساس تھا جس کے سبب سے اُن کے دِل سے درد انگیز نالے پھوٹنے لگے۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے مختلف جلسوں کے لئے لکھی ہوئی ان کی نظمیں، اُن کے جذبے اور احساس کی سمت پر دال ہیں جنہوں نے بعد میں ایک ہمہ گیر اور آفاقی جہت اختیار کر لی۔

قیامِ یورپ کے دوران اقبالؔ یورپ کی فکری، سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے۔ کئی مقامات کی سیر کی اور یورپ کی کئی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ یہاں پہلی بار اُنہیں ذہنی اور جذباتی طور پر ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔ اُنہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام کس طرح محنت اور سرمایہ میں ایک ناقابل عبور خلیج پیدا کر رہا ہے۔ یورپ سے واپسی کے بعد زندگی اور کائنات کے بارے میں اقبال کے نظریات بدل چکے تھے چنانچہ انہوں نے مسلمانوں اور عام انسانوں کو بڑے ہی فکر انگیز انداز میں پیغام دینا شروع کیا اور اپنے مرکزی تصور یعنی خودی کی افہام اور تفہیم کے لئے بڑی توانا اور جاندار نظمیں لکھیں۔ اُنہوں نے غلامی سے بیزاری اور آزادی کی توسیع کے تصورات پیش کئے۔ قرآن کے سرچشمے سے اپنے احساس اور جذبے کو آنچ دی اور خیر البشر کا تصور دیا۔

اِقبالؔ کی شاعری حرکت، عمل، آزادی اور خودشناسی کی شاعری ہے۔ اُنہوں نے نظم اور غزل پر یکساں اور بے پناہ قدرت کے وسیلے سے اپنی شاعری کا تانا بانا تیار کیا اور نہ صرف اپنی

فکر سے بلکہ اپنے فن کے حُسن سے بھی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔

اِقبآل کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ایک فلسفیانہ اور دُوسرا شاعرانہ۔اُنہوں نے مشرق اور مغرب کے فلسفیانہ افکار سے فیض حاصل کیا اور اپنی تمام شاعرانہ ہنر مندی کے ساتھ ان فلسفیانہ خیالات کو اپنی فکر کی گہرائی میں ڈھال کر پیش کیا۔اِقبآل کی عظمت اس بات میں ہے کہ اُنہوں نے کسی مخصوص فلسفے کو اپنا لائحہ عمل نہیں بنایا بلکہ فلسفوں کے اُس جوہر کو لیا جس کا مقصد محدود وطنیت کے حصاروں سے نکل کر آفاقیت اور اِنسانیت کی بقاو بہبود کا پیغام دینا تھا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بجا طور پر لکھا ہے:۔

''اُن کا فلسفہ صرف فلسفہ نہیں ہے۔حیاتِ انسانی کا ایک نظام فکر ہے جس میں انسان دوستی کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کے یہاں مختلف فلسفیوں کے گہرے اثرات ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کی بات اُنہوں نے مانی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے خیالات میں سے ایسی باتیں لے لی ہیں جن سے ان کا مقصد پورا ہوتا ہے............اسی طرح ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی ہے۔اس فلسفے کے جو عناصر ہیں وہ سب انسانیت کے گرد گھومتے ہیں۔'' (۱)

اِقبآل نے نٹشے، برگساں، کانٹ، ہیگل، مارکس، رومی، ابنِ سینا، ابن العربی، جمال الدین افغانی اور کئی دُوسرے مفکروں کے خیالات سے استفادہ کیا لیکن وہ اُن کی فکر کے دھارے میں بہہ نہیں گئے بلکہ اُنہوں نے اِن تصورات کو اپنی فکر کے ساتھ ملا کر ایک نئے آفاقی اور انسانی تصور کو پیش کیا اور اسی تصور کے ذریعے سے انسانی زندگی کو درپیش مسائل کا سامنا کرنے کا درس دیا۔بعض لوگوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اِقبال محض ایک اسلامی شاعر تھے۔اور اُنہوں نے صرف مسلمانوں کے انحطاط کے پیشِ نظر اسلامی طرزِ فکر کو اپنایا اور یہ کہ اُن کا سرچشمہ اسلامی نظریات ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ہی

(۱) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔جدید شاعری،ص ۱۶۱

اُنہیں انسانی ہمدردی اور مساوات کا درس دیا۔ اِقبال نے اپنے شعر کے وسیلے سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر اِسلام کی رُوح کو سمجھا جائے تو دُنیا کے بہت سارے دُکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے اور انسانی سربلندی کے لئے ایک لائحہ عمل طے کیا جا سکتا ہے۔ اِقبالؔ ایک ایسے نظام کے قائل ہیں جو مادیت اور رُوحانیت کے امتزاج سے خلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِقبالؔ رُوسی نظام کی تعریف کرتے ہیں جو طبقات کی حد بندی کو ختم کرتا ہے اور دولت کی مساوی تقسیم کا قائل ہے۔ اِقبالؔ اس نظام کی تعریف میں رطب اللسان ہیں لیکن وہ یہ بات ہرگز پسند نہیں کرتے ہیں کہ رُوحانی پہلوؤں کو نظر انداز کیا جائے۔ عبادت بریلوی بجا طور پر لکھتے ہیں:۔

> ''رُوحانیت کے بغیر اِنسان میں اخلاقی اقدار کی پاسداری اور خلوص و صدق دلی ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی۔ جو نظامِ حیات بہ یک وقت ان تمام باتوں کو پورا کرتا ہے وہ اُن کے خیال میں اسلامی نظامِ حیات ہے اور اسلامی نظامِ حیات ان کے خیال میں انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا دُوسرا نام ہے۔''(۱)

اِقبالؔ کے کلام کا مرکزی تصور تصورِ خودی ہے۔ خودی ایک طرح سے خودداری یا اپنے آپ کو پہچاننے کا دُوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مطابق اِقبال کے اِس تصور میں المانوی حکیم نٹشے کا بڑا اثر ہے۔(۲) اِقبال کا یہ تصورِ حیات اس بات پر دال ہے کہ زندگی بہ ذاتِ خود ایک مسلسل حرکت کا نام ہے۔ خودی اِقبالؔ کے مطابق بیداریٔ کائنات اور رازِ درونِ حیات ہے۔ یہ ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کی حدوں کا تعین کرنا مشکل ہے۔ اِقبالؔ کا تصورِ خودی صوفیائے کرام کے تصور سے مختلف ہے۔ صوفیا خودی کے احساس کو مٹانا چاہتے ہیں اور اِقبال اس کی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اِقبالؔ جب انسان کو اپنی خودی

(۱) ڈاکٹر عبادت بریلوی: جدید شاعری، صفحہ ۱۵۶

(۲) ڈاکٹر یوسف حسین خان: روحِ اقبال، صفحہ ۱۳۰

برقرار رکھنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں تو وہ نٹشے کے اس خیال کے قریب ہو جاتے ہیں کہ خودی عام انسانی تجربوں کا ماخذ ہے اور اس تصور کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ اسے ایک منفرد مقام حاصل ہوگا۔ نٹشے نے فوق البشر (Superman) کو خودی کا منتہا بنایا تھا اور اِقبالؔ نے انسانِ کامل کو(۱) اِقبال کا بار بار یہ کہنا کہ خدا کائنات میں اور انسانی وجود میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے تصور خودی کی امتیازی خصوصیت کو بیان کرتا ہے۔ اِقبالؔ نے خودی کا تصور بیان کرتے ہوئے دُوسروں کی خوشہ چینی نہیں کی بلکہ اسے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے اس تصور کو اسلامی رنگ دیا ہے۔ وہ خودی کے لئے خودگری، خودنگری اور خودشکنی کی منزلیں ضروری قرار دیتے ہیں۔ اِقبالؔ کے تصور خودی کا ذکر کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

> ''اِقبال کے ہاں ذاتِ مطلق کی ماہیت خودی ہے۔ خودی ایک اَنا یا ایغو کے بغیر مقصود نہیں ہوسکتی۔ اس مطلق خودی نے ذوق نمود اور ورزشِ وجود میں اپنے اندر سے لاتعداد اَنا یا ایغو یا خودی کے مرکز خلق کئے ہیں...... خودی کی ماہیت کو جاننا عرفانِ نفس بھی ہے اور عرفانِ رب بھی اور اس عرفان میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زورِ خودی سے حیات عالم وابستہ ہے اور ہر انفرادی نفس کی استواری اس کی زندگی کی ضامن ہے۔ جو قطرہ شبنم بنتا ہے وہ ٹپک کر ناپید ہو جاتا ہے لیکن جو قطرہ صدر نشین ہوکر اپنی خودی کو مستحکم کرلیتا ہے۔ وہ گوہر بن جاتا ہے جس کی موجِ نور تلاطم قلزم میں بھی منتشر نہیں ہوتی:'' (۲)

وہ خودی یا خودشناسی کو محض فرد کی ذات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے انسان کے مجموعی

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان: روحِ اقبال، ص ۱۳۵

(۲) خلیفہ عبدالحکیم: فکرِ اقبال، ص ۲۸۸-۲۸۹

نظام زندگی کا ایک اہم حصہ تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خودی کو اجتماعی زندگی سے علیحدہ نہیں رکھتے بلکہ اسے اسی کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ عبادت بریلوی، اِقبالؔ کے نظریۂ خودی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہی۔:

"فرد اور جماعت میں خودی کی تکمیل کیلئے اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کے خیال کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ توحید، رسالت اور قرآن پر ایمان بھی ضروری ہے۔ اِقبالؔ کے یہاں یہ باتیں محض رسمی اور روایتی انداز میں بیان نہیں ہوئی ہیں۔ اُنہوں نے ان میں نئے پہلو بھی نکالے ہیں، نئے گوشوں کو بھی تلاش کیا ہے۔" (۱)

اِقبالؔ اسی لئے فرد اور جماعت کے تعلق کا ذکر بار بار کرتے ہیں اور عشق کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں مردِ مومن کا جو تصور ہے وہ ایک ایسے انسانِ کامل کا تصور ہے جو اُسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب اس میں تمام ایسی خصوصیات موجود ہوں جن سے انسانیت کی تکمیل میں مدد مل سکے۔ اس لئے اس کے پاس صرف ایمان کے استحکام کی ہی ضرورت نہیں ہے بلکہ قوتِ عمل کا ہونا بھی لازمی قرار پاتا ہے۔

اقبالؔ کا ایک اہم تصور، تصورِ عشق ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ عشق کی بدولت ہی انسان اپنی شخصیت کو منوا سکتا ہے اور اپنے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو بیدار کر کے زندگی کی تکمیل کر سکتا ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جس کے ذریعے سے اس کی خودی کی پہچان ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، اقبالؔ کے تصورِ عشق کو ایک قدر کی حیثیت دیتے ہیں۔ جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے، اپنے خیال کی تشریح وہ یوں کرتے ہیں:۔

"عشق سے اقبالؔ کی مراد وہ جوش وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے

(۱) عبادت بریلوی: جدید شاعری، ص ۱۶۳

صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیل ذات کے لئے جذب وتسخیر پر عمل پیرا ہوتا اور ہر قسم کے مواقع پر قابو پاتا ہے۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے جس کا خاصہ مستی، انہماک اور جذبِ کُلی ہے۔ اس سے انسانی ذہن زمان ومکان پر اپنی گرفت مضبوط کرتا اور لزوم وجبر کی زنجیروں سے چھٹکارا پاتا ہے۔ اس کے بغیر حقیقی آزادی سے کوئی ہمکنار نہیں ہوسکتا............ اقبال عشق سے فطرت کی تسخیر کا کام لیتا اور اس کے ذریعے اپنے دل کو کائنات سے متحد کرتا ہے۔ اسی بدولت انسان کی نظر اتنی بلند ہوجاتی ہے کہ وہ اپنی ہمت مردانہ کے سامنے جبریل کو صیدِ زبوں سمجھنے لگتا ہے۔(۱)

بہر حال اقبال کے یہاں عشق کے تصور کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عشق اقبال کا ایک اہم کردار ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُن کے مطابق عشق کی حقیقت اس قدر بلند اور اہم ہے کہ حیاتِ انسانی کی عمارت اسی جذبے پر استوار ہے۔ یہ اپنے اندر زبردست تخلیقی قوت رکھتی ہے اور کسی نہ کسی طرح باہر پھیلنے لگتی ہے۔ مثلاً

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے
عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خاں: روحِ اقبال، ص ۵

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم!
نگاہِ عشق دِل زندگی کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شہباز نہیں

اقبالؔ کا تصور عشق اُردو کے دُوسرے شعراء سے بالکل مختلف ہے۔ وہ عشق کو ایک تخلیقی اور عملی قوت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے خیال میں عشق کے بغیر آزادی کے صحیح مفہوم کو سمجھنا دُشوار ہے۔ اس لئے اقبال کے نزدیک بڑے بڑے کارنامے عشق کے ذریعہ سے ہی عمل میں آتے ہیں۔ عشق کے معنی زندگی کے بلند ہونے اور کائنات کو تسخیر کرنے کے ہیں۔ دراصل یہ عشق ہی ہے جس سے انسان کی روح کو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ عشق کے تاثیر بے پناہ ہے اسی لئے اس کی صحیح کیفیت کو پیش کرنے کے لئے اقبال کہتے ہیں:۔

عشق تیری انتہا، عشق مری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام
خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ
عشق بُتاں سے ہاتھ اُٹھا اپنی خودی میں ڈُوب جا
نقش ونگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف

اقبالؔ نے عشق کا تصور کسی حد تک رومی سے لیا تھا۔ جو دین کا جوہر عشق کو بتاتے ہیں۔ اُنہوں نے عشق اور عقل کے بارے میں جہاں جہاں اظہارِ خیال کیا ہے وہاں ہمیشہ عشق کو عقل کے مقابلے میں افضل سمجھا ہے۔ اُن کے مطابق عشق بصیرت کا منبع ہے جو عقل کے بل بوتے پر چل کر حاصل نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک وجدان کی پرواز ہے اور عقل استدلال کی مظہر۔ عشق کی بدولت نمرود کی آگ میں ابراہیم بے خطر کود پڑتا ہے اور عقل لبِ بام تماشہ دیکھتی ہے۔ اقبالؔ نے بار بار عشق کو عقل اور دل کا رہبر کہا ہے اور کبھی عقل کی مخالفت نہیں کی ہے۔ وہ عقل کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور اس بات سے انکار نہیں کرتے ہیں کہ عقل

زندگی کے اسرار بھی حل کرتی ہے لیکن وہ اس بات کو بھی سمجھاتے ہیں کہ عقل ہی سب کچھ نہیں ہے۔ یوسف حسین خان عقل و عشق کے کردار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اقبال عقل اور عشق دونوں کو ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کا ہمدم و ہم نوا دیکھنا چاہتا ہے۔ عشق و وجدان عقل کلی کی وسیع تر اور بلند تر صورت ہے۔ علم اور عقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتے ہیں لیکن بغیر عشق کی مدد کی منزل کو طے نہیں کرا سکتے۔'' (۱)

ذِکر ہو چکا ہے کہ عقل اور عشق کلام اقبال میں اہم کردار ہیں اور ان کا ذکر وہ بار بار کرتے ہیں۔ انسانی وجود کی بساط پر عقل اور عشق کے رول کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن وتارِ رفو

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

لیکن عقل کی حکمت عشق کے بغیر محدود اور ناقص ہے۔ کارگہہ حیات میں عشق اور عقل کے اشتراک سے بڑے کارنامے انجام پا سکتے ہیں۔ عشق بے لگام ہو کر دیوانگی کی صورت

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان: روح اقبال، ص ۵۴

اختیار کرتا ہے۔ عقل، عشق کی اس کیفیت کو رد کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عشق کے ساتھ ساتھ عقل کا وجود نا گزیر بن جاتا ہے۔ یوسف حسین خان صحیح لکھتے ہیں:۔

''اقبال عقل کو انسان کی خدمت کا ایک وسیلہ سمجھتا ہے۔ وہ اس کا مخالف نہیں۔ وہ صرف اس کی کوتاہیوں کو سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے۔ جدید تمدن و تہذیب کا زیادہ تر رجحان عقل پرستی کی طرف ہے جو زندگی کو ایک روکھی پھیکی بے رنگ و بے لطف میکانیکی چیز سمجھتی ہے۔'' (۱)

اقبال یہ سمجھتے تھے کہ عشق کی اہمیت کو نظر انداز کرنے سے انسانی تمدن یک جا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ ''پرسوز غفلت'' پر زور دیتے رہے۔

اقبال کے تصورات میں ایک اہم تصور مردِ مومن کا تصور ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ دُنیا کی تمام قومیں، اپنی سربلندی، اپنی صلاحیتوں کے صحیح اور برمحل استعمال سے حاصل کرتی ہیں۔ اس کے لئے نہ صرف خلوص اور دیانتداری کی ضرورت ہے بلکہ زبردست محنت اور لگن کی بھی۔ اقبال کا مردمومن مکمل انسان ہے جو فقر کی دولت سے مالا مال ہے اور ساتھ ہی ساتھ بہادری، ایمانداری، قلندری اور ایثار کا مجسمہ بھی ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جس پر ابدی آسائش، ابدی سکون اور ابدی ایمان کا نظام تعمیر ہو سکتا ہے۔ اقبال کا مردمومن مکمل انسانیت کا نمونہ ہے۔ یہ مردمومن نٹشے کے فوق البشر (Superman) سے کہیں برتر صلاحیت کا مالک ہے اور اس کی کوئی دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔ اقبال کے مطابق وہ قرونِ وسطیٰ کے اسلامی نظام کا پروردہ ہے۔ وہ مردِ مومن ہے جس کی شانِ قلندری کے آگے بادشاہوں کا جلال سرنگوں ہوتا ہے۔ اقبال کے مطابق مردِ مومن، مردِ قلندر ہے۔ طاہر فاروقی لکھتے ہیں:۔

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان: روح اقبال، ص ۶۱

"بندہ مومن" یا "مردِ حُر" ایک ہی فرد کے دو نام ہیں۔ فقر اور عشق کے امتزاج سے جو ہیئتِ ترکیبی بنتی ہے وہی بندۂ مومن ہے۔"(۱)

اقبال کا مردِ مومن، عمل اور یقین پر بھروسہ رکھتا ہے اور وہ نہ صرف گفتار کا غازی ہے بلکہ کردار کا بھی غازی ہے۔ اُس کے یہاں جبرود ہے، وہ قدوسی بھی ہے اور قہاری اور غفاری بھی اس کی سرشت میں ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبرود
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

مردِ مومن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی خودی ہے۔ فقر اور قناعت اس کی دوسری بڑی خصوصیت ہے۔ اسے جسم کی نہیں رُوح کی آسودگی چاہئے۔ سلطنت اور بادشاہت اس کی منزل نہیں اس کی سلطنت رُوح کی پاکیزگی سے تعمیر ہوتی ہے۔ مادی جاہ وجلال اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا، روحانی سکون اس کی آماجگاہ ہے۔ اس منزل تک وہ فقر اور قلندری کے راستے سے پہنچتا ہے جو بہت ہی پُر پیچ اور دشوار گذار راستہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خودی کی صفات سے مالا مال ہوکر مردِ مومن نائب خدا ہو جانے کا مستحق ہو جاتا ہے لیکن وہ ہمیشہ اپنی مرضی کے مطابق نہیں چل سکتا۔ مردِ مومن کی تعریف میں حاتم رامپوری لکھتے ہیں۔

"مردِ مومن رُوئے زمین پر جب حکومتِ الٰہیہ کا قیام کرے گا تو اسے یہ آزادی ہرگز حاصل نہیں ہے کہ اپنی بے پناہ جسمانی قوت اور روحانی صلاحیت کے بل پر جی میں جو آئے کر گزرے کیونکہ وہ تو رحمتِ ایزدی کا مصداق ہوتا ہے اور ایسا فعل کر ہی نہیں سکتا جو خدا کے مرضی کے خلاف ہو۔ اس کا لائحہ عمل

(۱) تصورِ بشر اور اقبال کا مردِ مومن: حاتم رامپوری، ص ۳۰۸

قرآن کریم کی روشنی میں مرتب ہوگا اور وہ اپنی بے پناہ قوت کو
خدا آشنا عقل و دانش کا پابند بنا دیتا ہے۔" (۱)

اقبال کے مردِ مومن کی بنیادی خصوصیت اس کی خودی ہے لیکن یہ صرف خود شناسی اور خودنگری نہیں بلکہ بڑے سلیقے کے ساتھ اجتماعی خودی سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی اپنے آپ کو زندہ رکھتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اقبال کا مردِ مومن اسی خودی کے ساتھ ساتھ ملّت کی خودی کا بھی پاسدار ہے اور کہیں پر بھی ان دو کو ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے نہیں دیتا۔ اس لئے اقبال بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مرد مومن کی خودی اسی حالت میں پائیدار ہوگی جب وہ ملت کے ساتھ ایک رابطہ پیدا کر سکے۔ اقبال کے یہاں مردِ مومن کے تصور کے ساتھ ساتھ خیر وشر اور جبر وقدر کے تصور بھی آتے ہیں۔ یہ تصورات ایسے ہیں جن کا وجود شخصیت کے باہر نہیں ہے۔ مرد مومن کے ساتھ جذبۂ عشق ایمان کی صورت رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذات اور اپنی خودی پر یقین کرتا ہے اور وہ عشق کی قوت سے اس کی تکمیل کرتا ہے۔ حاتم رامپوری ان خیالات کی توضیح یوں کرتے ہیں:۔

"اُسے اگر بھروسہ ہوتا ہے تو صرف اپنی ذات پر، اپنی انانیت پر، اپنی قوتِ بازو پر، اگر وہ عاشق ہوتا ہے تو محض اپنے ہی جلال اور جمال کا، اُسے اپنی قاہری عزیز ہوتی ہے۔ وہ خود ہی عابد ومعبود، ساجد و مسجود ہو جاتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ "لا الٰہ" کا بھرپور یقین دِل جمنے کے ساتھ ہی خدا، مردِ مومن کے قلب میں جاگزین ہو جاتا ہے۔" (۲)

مردِ مومن جبر واختیار کے صحیح منصب کو پہچانتا ہے۔ اقبال کے نزدیک مردِ مومن کائنات میں انسان کو مجبور نہیں سمجھتا۔ وہ اس بات کا قائل نہیں ہے کہ انسان کا ہر فعل یا عمل

(۱) حاتم رامپوری: تصور بشر اور اقبال کا مردِ مومن، ص ۳۴۳

(۲) حاتم رامپوری: تصور بشر اور اقبال کا مردِ مومن، ص ۳۶۰

رضائے الٰہی پر منحصر ہے بلکہ یہ کہ انسان اپنی تقدیر خود بنا اور بگاڑ سکتا ہے۔ اگر وہ محض رضائے الٰہی پر کار بند رہے تو وہ کوئی عمل نہیں کر سکے گا۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ مردِ مومن کے دل میں چونکہ عشق اللہ ہوتا ہے لہٰذا وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اُس میں اللہ کی مرضی کا دخل ہوتا ہے۔ خیر اور شر دو مختلف چیزیں ہیں جو ایک دوسرے کو کاٹتی ہے۔ اقبال کا مردِ مومن خیر کی علامت ہے اس لئے وہ کبھی ایسا کام نہیں کرتا جو اسے راہِ مستقیم سے علیحدہ کر کے شر کے راستے پر ڈال دے۔ ڈاکٹر غلام عمر خان بجا طور پر لکھتے ہیں:۔

> ''اقبال ہی کے نزدیک وہ تمام افعال و اعمال جو تشکیل و استحکامِ خودی میں معاون ہوں خیر نہیں اور اس کے برعکس اگر خودی کو کمزور و ضعیف کا باعث ہوں شر ہیں۔'' (۱)

اقبال کی شاعری میں جلال و جمال کے تصور کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اسے وہ شاہین کے علامتی پیکر کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ شاہین کو دراصل مردِ مومن کی فقیرانہ شان دکھانے کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ اقبال نے اس کی علامتی پہلو کا ذکر ظفر صدیقی کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے:۔

''شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں'' اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہے۔

۱۔ خوددار اور غیرت مند ہے کہ اوروں کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ بلند پرواز ہے۔

۴۔ خلوت پسند ہے۔

۵۔ تیز نگاہ ہے۔ (۲)

---

(۱) حاتم رامپوری: تصورِ بشر اور مردِ مومن، ص ۳۹۰

(۲) ڈاکٹر غلام عمر خان: اقبال کا تصورِ خودی بحوالہ تصورِ بشر اور مردِ مومن از حاتم رامپوری، ص ۳۹۸

اِس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ نے شاہین کو اپنی شاعری میں اس قدر اہمیت کیوں دی تھی۔ شاہین اسی لئے اسلامی فقر کی نشانی ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک شاہین آزادی، حرکت، بے پناہ قوت اور اعلیٰ ظرف وذوق کی علامت ہے۔ وہ ان تمام پرندوں سے بلند وبالا ہے جن کی پرواز محض معمولی چیزوں کے حصول سے وابستہ ہے، اس لئے شاہین کا مقصد فکرِ روزگار سے کہیں بالاتر ہے۔ عزیز احمد اقبال کے تصورِ شاہین سے بحث کرتے ہوئے جب شاہین کا مقابلہ عام جانوروں سے کرتے ہیں تو وہ اس کی بلند پروازی اور غیرت وحمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''اقبال کا شاہین، شاہین کافوری میر وسلطان کا پالا ہوا باز ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا جو اپنی رفعتِ پرواز چھوڑ کر پھر سے اپنے مالک کے پاس اور آب ودانے کے پاس آبیٹھا ہے جو محض میر وسلطان کے اشارے پر شکار کرتا ہے۔ اقبال کے شاہین کافوری کے لئے آزادی انتہائی ضروری ہے۔ دریا وصحرا تو ایک طرف آسمان بھی اسی کے زیر پر ہے۔'' (۱)

اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ کوئی بھی ذِی روح اُس وقت تک تلاش وجستجو میں ناکام رہے گا جب تک وہ آزاد نہ ہو۔ یہی حال شاہین کا بھی ہے۔ اگر اُسے پابہ زنجیر کیا جائے تو اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ شاہین کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اپنے لئے خود آزادی کی فضا پیدا کرتا ہے اور زمینی حصار سے آزاد ہوکر بلند وبالا فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ اقبال شاہین کو اس لئے طاقتور اور عظیم تصور کرتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ زندہ شکار کی تلاش کرتا ہے، ایسا کرتے ہوئے وہ طاقت اور غلبے کی خصوصیات پیدا کرتا ہے۔ وہ مردار نہیں کھاتا۔ اس لئے وہ کرگس سے مختلف ہے کیونکہ کرگس بھی اگرچہ بلند فضاؤں میں پرواز کرتا ہے لیکن وہ تازہ اور زندہ شکار کو ہی اپنی خوراک نہیں بناتا بلکہ مردار ہی کھاتا ہے۔

(۱) عزیز احمد: اقبال نئی تشکیل، ص۲۲۵

اقبالؔ سے پہلے شاہین کو ان معنوں میں کسی نے استعمال نہیں کیا ہے۔ یہ اقبال کو ہی امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے شاہین کو ارتقاء کی ایک خاص قوت کے مشابہ قرار دیا ہے کیونکہ مشرق میں ہمیشہ شیر کو بالادستی حاصل رہی ہے۔ شاہین کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبوتروں پر جھپٹتا ہے جس سے بعض لوگوں نے اور خاص طور پر مجنوں گورکھپوری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کا یہ تصور فسطایت کی طرف لے جاتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ شاہین اقبال کے نزدیک درویشی یا فقر کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

اقبال کے کلام میں ان کے نظریات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری بامقصد ہے اور محض تفننِ طبع یا فن کی باریکیوں کا نام نہیں ہے۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں۔ اُن کا کلام زندگی سے متعلق اُن کے نظریات کا ترجمان ہے۔ اقبال کا نظریۂ زندگی قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔ وہ بار بار اپنے نظریۂ حیات کو یقینِ محکم اور عملِ پیہم کے استعاروں میں سمجھاتے ہیں۔ اقبال کا یہ نظریہ خالق و مخلوق کی اصلیت کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے رشتے کو بھی واضح کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اپنی زندگی کو بلند کر کے خدائی صفات پیدا کرنا ہی حیات کا مقصد ہے اور اسی سے کائنات تخلیق ہوتی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق خودی ہی ایک ایسی زبردست طاقت ہے جو مخلوق کو حیات کی بلندیوں تک لے جاتی ہے اور یہی انسان کو درجۂ کمال تک پہنچا سکتی ہے۔ ان کے نزدیک خودی زندگی کا راز ہے اور خودی کا راز پا کر ہی انسان خدا کا ترجمان ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں:۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

اقبال زندگی کے لئے اسلامی نظامِ حیات پر زور دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مادیت اور رُوحانیت جو زندگی کی اصل ہے اسلامی نظام میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس نقطے کی وضاحت یوں کرتے ہیں:۔

"مادیت اور رُوحانیت کا سنگم اگر کہیں ملتا ہے تو وہ اسلامی نظامِ حیات ہے اور یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کے لئے لازمی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی تکمیل کے بغیر انسانیت کی تکمیل اور بلندی ناممکن اور محال ہے۔ اسلام زندگی بسر کرنے کا لائحہ عمل صرف انسان اور انسانیت کے خیال سے پیش کرتا ہے۔ اس نے ہر اعتبار سے زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی تاکید کی ہے لیکن صرف مادیت اس کا نصب العین نہیں۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ روحانیت کی فضا میں پرواز کرنا سکھاتا ہے۔" (۱)

یہ واضح ہوگیا کہ اقبال کی شاعری کا مرکزی پہلو خودی کا تصور ہے۔ اقبال اس کی تشکیل میں عشق کی کارفرمائی سب سے اہم سمجھتے ہیں کیونکہ:۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروش
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال نے ہمیشہ زندگی کا پیام دیا ہے۔ وہ حرکت کو زندگی اور جمود کو موت کہتے ہیں۔ اُن کے خیال میں دُنیا ایک میدانِ کارزار ہے جہاں ہر شخص کو اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ وہ حرکت اور عمل پر برابر زور دیتے ہیں کیونکہ اسی پر کائنات کا انحصار ہے۔ اقبال انفرادیت کے علم بردار ہوتے ہوئے اجتماعی شعور کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر زندگی کی تمام صلاحتیں بروئے کار نہیں لائی جاسکتیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اقبال کے نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے:۔

(۱) ڈاکٹر عبادت بریلوی: جدید شاعری، ص ۱۵۴

"اگر خود شعور ذات کو آپ معروضی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں تو سوسائٹی کے وجود سے چشم پوشی ممکن نہیں، باوجود خودی کے فلسفے کا علمبردار ہونے کے اقبال اجتماعی زندگی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔"(۱)

یہی وجہ ہے کہ وہ فرد کی بقا کے ساتھ ہی اجتماعی بقا کا سلسلہ ذہن میں رکھتے ہیں جماعت نسل در نسل اپنے مقاصدِ حیات منتقل کرتی رہتی ہے اور اسی سے انسانی عمل بامعنی بن جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا آغاز اُنیسویں صدی کے آخری برسوں میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی اعتبار سے ہندوستان مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ہندوستان میں تحریک آزادی کو تیز تر کرنے کے لئے باضابطہ طور پر سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں اور انہوں نے تحریکِ آزادی کو نیا موڑ دے کر عام لوگوں کو بیدار کیا اور انگریزوں کے سامراجی جور واستبداد کے خلاف آہستہ آہستہ متحرک کیا۔ سارے ہندوستان میں ان تحریکوں سے ایک آگ لگ گئی۔

اقبال پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ یہی پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ پنجاب اُس زمانے میں سیاسی تحریک کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اقبال اپنے ماحول اور پوری سیاسی فضا سے دامن نہیں بچا سکتے تھے۔ چنانچہ جب وہ مؤثر انداز میں کچھ کہنے کے قابل ہوئے تو اُن کی زبان سے حب وطن کا اظہار ہونے لگا۔ اس سلسلے میں اُن کی پہلی نظم "ہمالہ" حبِ وطن کے موضوع پر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں اپنی پوری لطافت اور شائستگی کے ساتھ شاعر نے "ہمالہ" سے مخاطب ہو کر اپنے وطنی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کو آنے والے برسوں میں اس بات کا بخوبی احساس ہو گیا کہ ہندوستان انگریزوں کا غلام ہے۔ ایک حساس اور ذہین فنکار کی طرح انہوں نے اپنے ابتدائی دور کی شاعری میں سارے درد و غم کو سمیٹ لیا اور

(۱) ڈاکٹر یوسف حسین خان: فکر اقبال، ص ۲۲۱

اپنے خیالات کو پڑھنے والوں تک پہنچادیا۔ یہ پوری شاعری اُن کے دردِ وطن کے اضطراب سے بھری ہوئی ہے اور وہ بار بار کہہ اُٹھتے ہیں:۔

رُلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

اقبال کو یقین ہے کہ ان کے اہلِ ملک نا اتفاقی کا شکار ہوکر اپنی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اس لئے وہ اُنہیں درس دیتے ہیں:۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اِس کے بعد وہ تحصیلِ علم کے لئے ولایت چلے جاتے ہیں، جہاں اُنہیں پھر وطن کی یاد تڑپاتی ہے لیکن قیامِ یورپ کے دوران اُن کی فکر مختلف منزلوں سے گزرتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ وطن سے ملت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کی شاعری کا دھارا بدل جاتا ہے۔ ولایت سے واپسی کے بعد وہ اپنی شاعری میں ملت کے تصورات دیتے ہیں لیکن وہ یورپ کے قیام کے دوران انگریزی سامراج کی چیرہ دستیوں سے واقف ہو چکے تھے اور اُنہوں نے اس کی دھجیاں اُڑانا شروع کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف اُن کے نظام بلکہ اُن کی پوری تہذیب کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں:۔

دیارِ مغرب کے رہنے والے خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

چنانچہ اُن کی پوری شاعری میں جگہ جگہ سامراج دشمنی نظر آتی ہے۔ رُوس کا اکتوبر 1917ء کا انقلاب ان کے ذہن کو ایک اور جھٹکا دیتا ہے۔ اُن کو احساس ہوا کہ ایک مزدور

طبقہ سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کو کیسے ختم کر سکتا ہے اور وہ خود بھی انقلابِ روس کا استقبال کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''جب 1917ء میں انقلابِ روس ہوا اور دُنیا کے چھٹے حصے میں مزدور طبقے نے سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کا تختہ اُلٹا دیا تو اقبال نے آنکھیں کھول کر اس نئی روشنی کو دیکھا جس کے دور کا آغاز مشرق و مغرب میں ہو رہا تھا اور بطن گیتی سے آفتابِ تازہ کی پیدائش کی بشارت دی۔'' (۱)

چنانچہ وہ ''لینن خدا کے حضور میں'' اور ''فرمانِ خدا فرشتوں سے'' جیسی نظمیں لکھتے ہیں وہ ''ضربِ کلیم'' میں ''اشتراکیت'' اور ''کارل مارکس کی آواز'' جیسی نظمیں تخلیق کرتے ہیں جن کے مطالعے سے اشتراکیت سے ہمدردی اور سرمایہ داری سے نفرت کا احساس ہوتا ہے۔

اشتراکی نظام سے اس دلچسپی کی وجہ یہی ہے کہ اقبال کو بخوبی احساس تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کم ترقی یافتہ ملکوں کو ایک منڈی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر کے اپنی تجوریاں بھرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ ''خضر راہ'' میں سرمایہ اور محنت کے تضاد کو واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ''خضر راہ'' میں انہوں نے سرمایہ دارانہ استحصال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا یہ ہے پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

(۱) علی سردار جعفری: ترقی پسند ادب، ص ۱۱۱

دست دولت آفریں کو مردیوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
اِنتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

سوشلزم کے تصور کے خالق کارل مارکس کے تیئں اقبال کے خیالات بڑے واضح ہیں۔ اُنہوں نے جہاں دُنیا کے عظیم مفکروں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہاں کارل مارکس کے سلسلے میں اُن کے تبصرے کی بھی اہمیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ کارل مارکس پیغمبر نہیں ہیں لیکن ایک ایسے شخص ضرور ہیں جن کی بغل میں کتاب ہے۔

ع نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اسی طرح اُن کو کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب کہنا بھی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ مارکس کی قدر بہت زیادہ کرتے تھے۔ روس اور اس کے نظام کے تیئں اقبال کے ان خیالات کی وضاحت پروفیسر محمد عثمان کے مضمون سے ہوتی ہے، جہاں وہ کہتے ہیں:۔

"اقبال کو رُوس کی تین ادائیں پسند ہیں۔ پہلی یہ کہ رُوس نے ملوکیت کا خاتمہ کر کے اُس کے بوجھ تلے انسانیت کو آزاد کرایا۔ دوسرے افرنگ کی سرمایہ داری کا رُوس جانی دشمن ہے اور اس کے عزائم کی ہیبت سے مغربی سامراج پر لرزہ طاری ہے اور تیسرے رُوس کے نظام میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں۔ جس کو بھڑکا کر افرنگ نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔ یہ سب باتیں ملوکیت سے بے زاری، سرمایہ داری سے نفرت اور ذات پات اور رنگ اور نسل سے بالاتری، اسلام اور اشتراکیت

کی مشترکہ خصوصیات ہیں۔" (۱)

اقبال کو اشتراکی نظام سے اس لئے ہمدردی ہے کہ اس نے سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے استحصال اور نسلی اور طبقاتی امتیازات کو ختم کرنے کے لئے بڑا کام کیا۔ وہ اگر چہ اشتراکیت اور روسی نظام کے مداح ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس میں خدا کی ہستی کا احساس بھی ہو۔ ایسا نظام انہیں اسلام میں نظر آتا ہے، اس لئے وہ اس کو بہتر سمجھتے ہیں۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام سویل اور ملٹری گزٹ لاہور کے 30/جولائی 1931ء کے کھلے خط میں رُوسی نظام پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا:۔

> "چونکہ بالشوازم ماخدا تقریباً اسلام کے مماثل ہے۔ مجھے تعجب نہ ہوگا اگر وقت گزرنے پر یا تو اسلام رُوس کو نگل لے یا رُوس اسلام کو۔" (۲)

اقبال کو اشتراکیت کے رہنماؤں سے بڑی دلچسپی تھی حتیٰ کہ وہ مارکس کی تعلیمات کے معترف تھے لیکن وہ مادی جدلیات کو اپنا نہ سکے۔ اس لئے کہ وہ رُوحانی طاقت کے قائل تھے۔ وہ اشتراکیت کو انسانیت کے لئے ایک بہتر نظام سمجھتے ہیں اور اسی لئے وہ ہمیشہ رُوسی اشتمالیت کا اسلامی اشتراکیت سے موازنہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں دونوں میں کئی چیزیں مشترک نظر آتی ہے ●●

---

(۱) حنیف رامے: اقبالؔ اور سوشلزم، ص ۴۴

(۲) جسٹس ایس اے رحمٰن: اقبال اور سوشلزم، ص ۴۱

مولانا ابوالکلام آزاد

ہندوستان کی تحریک آزادی میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا نہ صرف ایک منفرد انداز کے ادیب، اعلیٰ پایہ کے ایک مدبر، ایک فلسفی، ایک شعلہ بیان مقرر اور تحریک آزادی کے ایک سچے رہنما بھی تھے۔اُن کی شخصیت کئی خانوں میں بٹی ہوئی تھی وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ وطن کے جانباز سپاہی بھی تھے اور دم واپس تک ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اُن کے انتقال پر ملال پر آنسو بہاتے ہوئے کہا:۔

"میں نہیں کہتا کہ مولانا آزاد کے بعد ہندوستان میں عظیم انسان پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ یقیناً پیدا ہوں گے لیکن جو عجیب وغریب اور مخصوص عظمت مولانا آزاد کو حاصل تھی وہ اب نہ تو ہندوستان میں کسی کو نصیب ہوگی نہ ہندوستان کے باہر کسی کے حصہ میں آئے گی۔"

محی الدین احمد خاندانی نام ابوالکلام لقب، تخلّص آزاد 1888ء میں مکہ معظّمہ میں دلی کے ایک علمی وادبی اور مذہبی خانوادے میں مولوی خیر الدین کے ہاں تولد ہوئے۔ جنہوں نے کسی زمانے میں مکہ معظّمہ میں رہائش اختیار کی تھی۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی خاندانی رواج کے مطابق حاصل کی۔ 1992ء میں انہوں نے رسم بسم اللہ کی شروعات کی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے ہی دامن گیر تھا۔ اُردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانوں میں انہوں نے بے پناہ استعبداد پائی تھی۔ 1898ء میں اُن کا خاندان ہندوستان واپس آگیا اور کلکتہ میں بس گیا۔ شعروشاعری کی طرف مولانا کی طبیعت بچپن سے ہی مائل تھی۔ چونکہ وہ شروع سے ہی غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ اُنہوں نے حافظ بھی غضب کا پایا تھا۔ جس چیز کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ہمیشہ اُن کے دل ودماغ میں رہتا تھا۔ مولانا نے انگریزی تعلیم خود ہی اپنی کوششوں سے حاصل کی اُنہوں نے اپنی محنت لگن اور صلاحیت سے اس میں بھی کمال حاصل کیا۔

مولانا آزاد کا زمانہ سیاسی اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں کئی تحریکیں اُبھریں۔ تحریک خلافت، ستیہ گرہ، عدم تعاون کی تحریک، ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ...... یہ تمام چیزیں برطانیوی سامراج کے خلاف ہندوستانی عوام کے غم وغصے کی آگ تھی۔ گاندھی جی اور نہرو کی قیادت نے عوام کی بھرپور رہنمائی کی اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی نمائندگی کرکے اس کو صحیح سمت ورفتار عطا کی۔ مولانا آزاد، سرسید احمد خان سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کیلئے کام کرتے رہے لیکن جوں جوں اُن کا شعور بیدار ہوتا گیا، اُن کے نظریات میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں رہنے بسنے والے تمام مذاہب کی خوشحالی اور ترقی کے متمنی تھے۔ اس لئے وہ کانگریس میں شامل ہو گئے اور جنگِ آزادی میں اپنا حصہ ادا کرنے کیلئے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرتے رہے۔

مولانا نے اپنے پیغام کو عام کرنے کے لئے اور نوجوانوں میں سیاسی اور سماجی بیداری

پیدا کرنے کے لئے کلکتہ سے 1912ء میں الہلال کے نام سے اپنا ایک اخبار جاری کیا۔ اس میں اُنہوں نے سماجی، اصلاحی اور علمی و ادبی موضوعات پر مقالات شامل کئے۔ مولانا کی تحریروں میں فصاحت اور بلاغت ہے اُن کا نثری اسلوب دیکھ کر علامہ شبلی اور حالی جیسے بزرگ بھی اُن کی ذہانت کے قائل ہو گئے۔ حتیٰ کہ اُس دور کے معروف صحافی، سیاستدان اور شاعر حسرت موہانی نے کہا۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزا نہ رہا

الہلال کی حقیقتانہ پالیسی دیکھ کر سرکار لرزہ براندام ہو گئی۔ اُنہوں نے مولانا پر قسم قسم کے دباؤ ڈالنے شروع کئے لیکن مولانا جیسے عظیم مفکر، منفرد انداز کے ادیب اور نڈر صحافی ثابت قدم رہے۔ اُنہوں نے اپنے اصولوں کا سودا نہیں کیا بلکہ اپنی تحریروں سے ہندوستانی عوام کو بیدار کرنے کے لئے حتی الامکان کوشش کی۔ کچھ عرصہ کے بعد الہلال پر سرکاری عتاب نازل ہوا اور یہ اخبار بند کرنا پڑا۔ جلد ہی اُنہوں نے البلاغ کے نام سے ایک اور اخبار جاری کیا اور اپنی خوبصورت نثری اسلوب سے اپنے مشن کو جاری رکھا وہ علمی، قومی، سیاسی اور سماجی محاذوں پر لڑتے رہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران اُنہیں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ 1940ء میں مولانا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ یہاں بھی وہ اپنی بے پناہ ذہانت اور خداداد صلاحیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے اور امن کے خواہاں تھے۔ 1947ء میں جب ہندوستان انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا تو مولانا ہندوستان کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس میدان میں بھی انقلاب لایا۔ مولانا نے اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں جنگ آزادی کی ساری داستان منقش کی۔ یہ کتاب 1958ء میں منظر عام پر آئی۔

مولانا آزاد ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہ صرف ایک بہترین سیاستدان

اور قومی رہنما تھے بلکہ وہ اعلیٰ پایہ کے ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ تذکرہ، غبارِ خاطر، کاروانِ خیال اور ترجمان القرآن۔ اُن کی چند قابل قدر تصانیف ہیں۔ یہ تصانیف اُردو ادب میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ مولانا کی متعدد چھوٹی بڑی تصانیف شائع ہو چکی ہیں لیکن غبارِ خاطر اور ترجمان القرآن نے اُنہیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں پہنچا دیا۔

مولانا آزاد تقریباً 12 برس ہندوستان کے وزیر تعلیم رہے۔ اُنہوں نے اس دور میں تعلیم کے میدان میں انقلاب لایا۔ اُنہوں نے نہ صرف پنڈت نہرو اور گاندھی جی کے تعلیمی نظریئے کو آگے بڑھایا بلکہ اس شعبے میں بھی ایک رہنما کی حیثیت سے اپنا فرض نبھایا۔ انہوں نے ناخواندگی اور جہالت دور کرنے کے لئے بھی کئی تعلیمی اقدامات کئے اور اس کے لئے واضح پالیسی مرتب کی۔ اسی لئے آج ہمارا ملک جاپان اور چین کے بعد سائنسی تعلیم میں سب سے آگے ہے۔

مولانا آزاد نے سائنسی تعلیم و ترقی کے لئے شانتی سروپ بھٹناگر جیسے سائنس دان کی سربراہی میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ قائم کیا۔ ایٹمی ترقی کا ادارہ بھی انہی کی سربراہی میں وجود میں آیا۔ انڈین کونسل فار ایگریکلچر اینڈ سائنٹفک ریسرچ کا قیام بھی عمل میں لایا اور انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ کی داغ بیل بھی ڈالی اور ملک میں سائنسی تحقیقاتی مرکز کا قیام بھی عمل میں لایا۔ سماجی علوم کے لئے انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ سینٹر اور انڈین کونسل فار سوشل سروس ریسرچ سینٹر اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن سنٹر بھی قائم کیا۔ ان تمام چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کی تعلیمی پالیسی گونا گوں خصوصیات کی حامل تھی ان کی تعلیمی پالیسی کا ایک رخ اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ اُن کی قیادت میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا بھی قیام عمل میں لایا گیا اور ملک میں یونیوسٹیوں کا جال بچھا دیا گیا۔ اُنہوں نے مغربی ملکوں اور ایشیا کے مسلم ممالک سے تہذیبی اور سیاسی رابطوں کو اہمیت دی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ادارہ علوم شرقیہ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ادارہ علوم اسلامی کا قیام عمل میں لایا۔

مولانا نے نیشنل آرکایویز اور نیشنل میوزیم جیسے ادارے بھی قائم کیئے۔ زمانہ قدیم کے بیش بہا دستاویزوں اور نشانیوں کو محفوظ کرنے کیلئے مختلف ادارے قائم کیئے۔ انہوں نے کلاسیکی زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان اور ہندوستان کے قدیم اثاثے کی بازیافت کی۔ فنون لطیفہ کو فروغ دینے کیلئے انہوں نے مختلف اکادمیوں کا بھی قیام عمل میں لایا۔ جن میں ساہتہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت ناٹک اکادمی شامل ہیں جو تیز رفتار سے کام کر رہی ہیں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے مختلف اسکیمیں روبہ عمل میں لا رہی ہیں۔ افسوس کو ہندوستان کا یہ تابندہ ستارہ 1958ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے طلوع ہو گیا لیکن اُن کے کارہائے نمایاں سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا ●●

فیض

ایک انسان دوست شاعر

فیض احمد فیض عصر حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور معتبر شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ مجاز، جذبی، سردار جعفری، غلام ربانی تاباں اور جوش ملیح آبادی جیسے ترقی پسند شعرائیں سرفہرست ہوتے ہوئے بھی حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، روش صدیقی جیسے غیر ترقی پسند شعراء سے دور نہیں۔ فیض کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے۔ اُن کی شاعری میں حقیقت ورومان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند شاعر بھی ہیں اور اُن کی شاعری پر اشتراکیت کا بھی گہرا اثر ملتا ہے۔ فیض انقلابی شاعر بھی ہیں لیکن اُن کے ہاں دوسرے انقلابی شاعروں کی طرح گن گرج نہیں پائی جاتی ہے بلکہ وہ نرم اور ملائم لہجے میں بات کرنے کے قابل ہیں۔ مشہور ترقی پسند ادیب پرکاش پنڈت اپنے مضمون نسلوں کا شاعر میں رقمطراز ہیں:

"فیض احمد فیض اُردو کے اُن گنتی کے بڑے شاعروں میں

سے ہیں جنہوں نے فن شاعری میں نئے نئے تجربات تو کئے لیکن
ان کی بنیاد ہمیشہ پرانے تجربوں پر رکھی اور اس اٹل سچائی کو کبھی
فراموش نہیں کیا کہ ہر نئی چیز پرانی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں کسی طرح کی
اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ غیر واضح اور ذہن کو پہنچ سے پرے
کی مثالیں دے کر وہ ہمیں الجھن میں نہیں ڈالتا بلکہ اپنے نرم
اور دل پذیر لہجہ میں ہم سے سرگوشیاں کرتا ہے اور اس کی سرگوشیاں
اتنی معنی خیز ہوتی ہیں کہ کچھ ایک لفظ کان میں پڑتے ہی ہم اس کی
پوری بات سمجھ جاتے ہیں۔(۱)

فیض کا شمار اگرچہ ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے لیکن اُنہوں نے روایتی شاعری کی صالح ادبی قدروں سے کبھی گریز نہیں کیا بلکہ وہ شروع سے ہی نئے شعراء کے ساتھ ساتھ قدیم اساتذہ کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ اسی لئے ان کے کلام میں نئے اور عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ روایتی شاعری کی ساری رعنائی ملتی ہے۔

فیض کا زمانہ نہ صرف برصغیر ہندوپاک میں سیاسی سماجی اور اقتصادی اُتھل پتھل کا زمانہ تھا بلکہ یہ زمانہ تمام دُنیا میں ہنگامہ خیز زمانہ رہا ہے۔ کئی تحریکیں اُبھریں اور ڈوبیں۔ نئے انقلابات رونما ہوئے۔ پرانی اور فرسودہ قدریں آہستہ آہستہ سے ختم ہو رہی تھیں۔ انسان نئے تجربوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی دُنیا آباد کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ اس دور کے کم وبیش تمام قلمکار عملی طور پر اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو چکے تھے اور نئی منزلوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ فیض اس تحریک کے روح رواں تھے لیکن اُنہوں نے ایک الگ اور انفرادی راہ اپنانے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے روایت کی پاسداری بھی کی اور ترقی پسند تحریک کے اصول وضوابط کا احترام بھی کیا۔ اسی لئے ان کی شاعری میں کلاسکی

(۱) رسالہ فن وشخصیت بمبئی آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۸۱ شمارہ نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲۔ ص ۹۱

روایت ہر جگہ عیاں ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے ایک مضمون میں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''وہ اُردو شاعری کی ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی دین ہے۔ اُن کی فکر انقلابی تھی لیکن لہجہ غنائی تھا۔ وہ ایک دردمند دِل رکھتے تھے۔ اُنہوں نے انقلابیت کے لئے غنایت کو غنایت کے لئے انقلابیت کو کبھی قربان نہیں کیا بلکہ اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت سے انقلابی فکر اور عاشقانہ لہجے کو ایسا آمیز کیا کہ اُردو شاعری میں ایک نئی جمالیاتی شان پیدا ہوگئی اور ایک نئی طرز فغاں کی بنیاد پڑی جو فیض سے منسوب ہوگئی۔(۱)

''نقش فریادی'' سے لے کر فیض کی کلیات تک فیض کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ نقش فریادی میں وہ دُنیا کے رنگ و بو میں سرشار نظر آتے ہیں۔ ان پر تغزل کا رنگ غالب ہے۔ جذبات کی فروانی ہے۔ عام رومان پرور شعراء کی طرح حسن وعشق کی داستانیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں فیض جوان تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں جوانی کی ساری سرمستی نظر آتی ہے۔ ''دستِ صبا'' میں فیض زندگی سے حاصل کئے ہوئے تجربوں کو بیان کرتے ہیں۔ ''زندان نامہ'' اور ''دست تہ سنگ'' میں فیض ایک نئے زاویے سے سامنے آتے ہیں۔ ''شام شہر یاراں'' اور میرے دل میرے مسافر فیض کے ایسے شعری مجموعے ہیں جن میں فیض کی شاعری کے نئے رنگ سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے ترا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے

(۱) ماہنامہ بیسویں صدی دہلی فیض بیدی نمبر، جنوری ۸۵۔ ص ۲۹

دیکھ کر آہنگر کی دوکان میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(بول)

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم
گراں ہے دِل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائش حسنِ نگار کا موسم
خوشا نظارۂ رُخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دل بے قرار کا موسم
حدیث بادہ وساقی نہیں تو کس مصرف
حرام ابرِ سرکوہسار کا موسم

............(طوق ودار کا موسم)

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے ،جسم وجاں بچا کے چلے
ہے اہل دِل کے لئے اب یہ نظم بست وکشاد
کہ سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لئے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
مگر گذارنے والوں کے دن گذرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح وشام کرتے ہیں

(نثار میں تیری گلیوں کے)...........

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس وخاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب
اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سُلگتی ہوئی مدھم مدھم

(یاد)...........

فیض کی شاعری میں عشق ومحبت کی تب وتاب ملتی ہے۔ان کے کلام میں درد وگداختگی اور کیف وسرمستی سے تغزل کا ایک حسین روپ سامنے آتا ہے اور عشق کا ذکر اسے دوآتشہ بناتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عشق فیض کے لئے ایک زبردست شعری محرک ہے۔وہ

اسے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ان کا عشق محض عشق ونشاط کی بصیرت نہیں دیتا بلکہ اس سے بہت آگے لے جاتا ہے۔ بقول پروفیسر قمر رئیس، فیض کی شاعری عشق ومحبت کے والہانہ جذبات سے معمور ہے۔ اس عشقیہ شاعری میں جہاں ہزار شیوۂ حسن کی رعنائیاں سانس لیتی ہیں وہاں اس میں سوز ودرد کی تیکھی لہریں بھی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:۔

عشق منت کش قرار نہیں
حسن مجبور انتظار نہیں

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

فیض تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

عشق دِل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

فیض انسان دوست شاعر تھے۔انہیں انسان عزیز تھا۔ وہ قتل وغارت، مار دھاڑ اور فساد وانتشار سے نفرت کرتے تھے۔اُن کے دِل میں عشق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اُن کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ غضب کا تھا۔فیض نے ایشیاء اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کئے تھے۔ اُنہوں نے اس بے کس اور مظلوم انسان کا جگہ جگہ جائزہ لیا تھا۔ غربت اور ناداری کے سائے میں پلے ہوئے انسان کو دیکھا تھا۔کسانوں اور مزدوروں کی حالتِ زار دیکھی تھی۔ جنگ عظیم سے پیدا ہونے والی تباہ کاریوں کا جائزہ لیا تھا۔وہ ہر بار ظلم وتشدد کے خلاف آواز بلند کرتے رہے اور غریبوں اور مظلوموں کا مداوا کرتے رہے۔ انقلاب کی آنچ سے ان کا دل پگھل کر موم ہو گیا تھا۔وہ سماجی نابرابری انسانیت کے مصائب اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے خلاف نبردآزما ہوئے تھے۔فیض کی دختر نیک اختر منیزا فیض کے اس جذبے کا احساس دلاتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''اُن کا (فیض کا) جسم وجان میں میرے خیال میں خون کے بجائے محبت کا پیار کا دریا ٹھاٹھیں مارتا تھا۔وہ کہتے تھے جتنا لوگوں کو پیار کرو گے وہ اس سے بڑھ کر تمہیں پیار کریں گے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ زندگی کی کدورتیں زندگی کے اُس دریا

میں ڈبودوں جو مجھے ابو سے ملا ہے۔اور پھر ساری انسانیت سے
والہانہ پیار کروں۔(۱)

''مجھ سے پہلی سی محبت نہ مانگ'' فیض کی زندگی کا ایک اہم موڑ ہے۔ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہاں سے فیض کی رومانیت دور ہونے لگتی ہے اور وہ حقائق کی دُنیا میں سانس لینے کا عزم کرتے ہیں۔ خیالات میں پختگی اور شعور میں بالیدگی قدم قدم پر نظر آنے لگتی ہے اور ان کی نظموں میں درد و کسک اور موسیقی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ فیض کی زندگی کا ایک اہم پڑاؤ ہے۔ جس نے ان کی شاعری کو ایک ایسے راستے پر کھڑا کر دیا جہاں خیالات کا بحر بیکراں سامنے آجاتا ہے۔ وہ غم جاناں سے زیادہ غم دوراں میں مبتلا ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ دل کی دنیا سے زیادہ عقل کی دنیا میں گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے یہاں اشتراکیت جنم لیتی ہے اور وہ ایک الگ اور انفرادی دُنیا میں رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہم عصر اور دوست احمد ندیم قاسمی ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

> ''فیض کو سامراج سے نفرت ہے۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نفرت ہے۔ محکومی اور غلامی سے نفرت ہے۔ گنے چنے انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے سفاکانہ استحصال سے نفرت ہے۔ جبر اور ظلم سے نفرت ہے۔ اتنی بہت سی نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شاعری میں چیخوں اور فریادوں سے کان پڑی آوزیں نہیں سنائی دیتیں مگر فیض کے ہاں شعور کی کوئی کیفیت ہے ہی نہیں۔ دراصل ان سب نفرتوں پر فیض کی بنی نوع انسان سے محبت آسمان کی طرح چھاگئی۔ یہ ساری نفرتیں فیض کی ہمہ گیر انسان دوستی کی لپیٹ میں آئی ہیں اور یوں فیض کی مقصدی

(۱) شبستان فیض نمبر، ص ۵۹

شاعری اس اعلیٰ معیار کی شاعری ہے جس کے علاوہ کوئی اور معیار ابھی تک انسانی ذہن کو سوجھا نہیں۔ (۱)

سرزمین سیالکوٹ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اُس نے اُردو کے دو عظیم شاعروں علامہ اقبال اور فیض کو اپنی کوکھ سے جنم دیا اور پروان چڑھایا لیکن دونوں شعراء میں نظریاتی فاصلہ ہونے کے باوجود قربت کا احساس ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ انسانی مسائل کو فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ پیش کرنا تھا۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کو انسانی زندگی کے ساتھ پیوست کر کے پیش کیا۔ فنی اعتبار سے بھی وہ ایک ترقی پسند ذہن رکھتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے بھی اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال اور فیض کے ہاں کئی چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں کا وطن مالوف سیالکوٹ ہے۔ دونوں وطن پرست اور امن پسند شاعر تھے۔ دونوں شاعری، علم وادب، سیاست اور قانون سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ دونوں قانون کی اعلیٰ ڈگریاں پاس کر چکے تھے۔ قیام لندن کے دوران میں پہلی بار علامہ اقبال سے فیض کی ملاقات ہوئی تھی اور اُنہیں نے ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا تھا۔ شعر وسخن میں اگرچہ فیض نے کسی کی شاگردی قبول نہیں کی تھی بلکہ وہ خود اپنے ذوق وجدان کو اپنا رہبر بناتے رہے تاہم وہ اپنے احباب میں سے صوفی تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری اور کرنل مجید ملک سے کبھی کبھی مشورہ لیا کرتے تھے۔ البتہ وہ علامہ اقبال کو اپنا معنوی اساتذہ میں شمار کرتے تھے۔ فیض اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی میں فیض حاصل کرتے رہے۔ فیض کے والد بزرگوار چودھری سلطان محمد خان اپنے دور کے ایک مقبول ومعروف بیرسٹر تھے۔ اُن کے احباب میں ممتاز علمی وادبی شخصیات شامل تھیں۔ علامہ اقبال کے ساتھ بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔ لہٰذا علامہ اقبال کی شخصیت سے فیض شروع

(۱) شبستان فیض نمبر، ص ۸۹

سے ہی آشنائی رکھتے تھے۔ ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی کے فیض اور بیدی نمبر کے مرتبین ’’فیض احمد فیض کے مختصر حالات‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’فیض کے والد چودھری سلطان محمد خان سیالکوٹ کے نامی گرامی اور ذی حیثیت بیرسٹروں میں تھے۔ علم وادب سے آپ کو بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبال، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاالدین، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ممتاز علمی وادبی شخصیتوں سے آپ کے ذاتی مراسم اور خصوصی روابط تھے۔ اُن کا بیشتر وقت ان حضرات کی صحبتوں اور محفلوں میں گذرتا تھا...... چنانچہ فیض کی ذہنی اور فکری تربیت میں اس ماحول نے بھی نمایاں حصہ لیا۔‘‘ (۱)

فیض کے اوّلین شعری مجموعے نقش فریادی میں اقبال کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم شامل ہے۔ یہ نظم علامہ اقبال کے تیئں فیض کے گہرے عقیدت واحترام کی غماز ہے۔ نظم کا یہ بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزلخواں گزر گیا
سنسان راہیں، خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دِلوں میں اُتر گیا
اب دور جاچکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں

(۱) ماہنامہ بیسویں صدی، نئی دہلی فیض بیدی نمبر ص ۲۷

چند اک کو یاد ہے کوئی اُس کی ادائے خاص

دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے

اور اس کی لے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں

فیض نے ۱۴ ر سال کی عمر میں حفظ قرآن سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ شروع سے ہی ذہین، محنتی اور خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ مطالعہ اور مشاہدہ میں انہیں بے پناہ دلچسپی تھی۔ اُن کے والد بزرگوار اُنہیں مختلف علمی و ادبی محفلوں میں اپنے ساتھ لیتے تھے۔ اس طرح سے اُنہیں آداب محفل کی بھرپور جانکاری ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کے سامنے اُنہیں بچپن میں تلاوتِ قرآن کرنے کا موقعہ فراہم ہوا۔ محفل کے اختتام پر علامہ نے اُنہیں دُعائیں دیں۔ اس طرح سے اُنہیں بے پناہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے انگریزی زبان کے معروف صحافی اور ادیب خالد حسن تحریر فرماتے ہیں:۔

"فیض صاحب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ اُن کے بچپن سے اُن کے والد اُن کو انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں لے گئے تھے۔ علامہ اقبال بھی اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ فیض سے تلاوتِ قرآن کرائی گئی۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ایک اونچی میز پر کھڑا کیا گیا۔ جب میں تلاوت کر چکا تو اقبال نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا تم کتنے ذہین اور اچھے بچے ہو۔ میرے والد کو علامہ مرحوم سے نیاز حاصل تھا۔" (۱)

فیض غزل اور نظم دونوں اصناف ہر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُنہوں نے غزل کو نئے مضامین سے آراستہ کیا۔ نئی زبان دی اور نیا لہجہ عطا کیا۔ اُن کا کلام اُردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض ناقدین فن کی رائے میں وہ اُردو میں تنہا شاعر ہیں۔

(۱) رسالہ فن و شخصیت، فیض نمبر ۱۹۸۱ء شمارہ نمبر ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ص ۶۳۲)

جنہوں نے اُردو شاعری کو ایک نئے موڑ سے آراستہ کیا۔ اُن کی غزلوں میں گہری رمزیت ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کلاسیکی غزل سے واقفیت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے غالب کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی بھی پیروی کی اور اپنے مشن کو آگے بڑھایا۔ خود اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ہم نے تو محض غالب اور علامہ اقبال کی پیروی کی ہے ہم نے غزل کو ترک نہیں کیا جیسا کہ غالب اور اقبال نے اس میڈیم کو ترک نہیں کیا۔ یہ خوبصورت میڈیم ہے لیکن نئے تقاضوں کے ساتھ اس میں تبدیلی کا آنا ضروری ہے۔ یہ انقلاب ہم نہیں لائے۔ اس کا سہرا تو غالب اور اقبال کے سر ہے۔ بھئی وہ بہت بڑے استاد ہیں۔ ہم نے تو ان سے بہت کچھ سیکھی ہے۔'' (۱)

اس اقتباس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ فیض، علامہ اقبال سے بے حد متاثر تھے۔ اُنہیں غالب کی شاعری بھی عزیز تھی۔ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام دستِ صبا میں اپنی ایک خوبصورت غزل غالب کی نذر کی ہے لیکن بقول خالد حسن، فیض صاحب اقبال کے بہت زبردست منعقد ہیں۔ علامہ اقبال نے مزدوروں کے گیت لکھے مگر مزدوروں کی عملی سیاست میں نہیں اُلجھے، اس کے برعکس فیض مزدوروں کے کاز کو آگے بڑھاتے گئے۔ فیض ٹریڈ یونین کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ اس طرح سے وہ خود بھی میدان میں اُتر کر مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتے رہے۔ درج ذیل اقتباس سے فیض کی سماجی اور ادبی خدمات نیز مزدوروں اور پسماندہ طبقہ کے لوگوں سے ان کی محبت کی وضاحت ہوتی ہے:۔

''1936ء میں سجاد ظہیر اور صاحبزادہ محمود الظفر کی تحریک پر لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ فیض کی

(۱) رسالہ فن و شخصیت، فیض نمبر جون ۱۹۸۱ء شمارہ نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲۔ ص ۴۸۵

ذاتی اور مساعی سے پنجاب میں انجمن ترقی پسند مصنّفین بہت جلد
ایک عوامی ادبی تحریک کی صورت میں پھیل گئی۔ قیام پاکستان کے
بعد فیض مزدور وتحریک میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ ٹریڈ یونین
فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت
سے انہوں نے آئی۔ ایل او کے اجلاس منعقدہ سان فرانسکو اور
جنیوا میں بھی شرکت کی۔ (۱)

حق تو یہ ہے کہ فیض بھی علامہ اقبال کی طرح انسان دوست شاعر تھے۔ اُن کی شاعری وطن دوستی، امن پسندی اور انسانیت کا پیغام دیتی ہے اور یہی کیا ہم اہم ہے۔

(شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں کے زیر اہتمام منعقد کئے گئے دوروزہ فیض سیمینار میں ۳۰، ۳۱ رمئی ۲۰۱۱ء کو پیش کیا گیا)

●●●

(۱) ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی فیض بیدی نمبر جنوری ۸۵ء ص ۲۸

صوفی تبسم کی شاعری پر
اقبال کے اثرات

صوفی تبسم کا اصلی نام صوفی غلام مصطفیٰ تھا۔ وہ 4 ر اگست 1899 کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے اسلاف کسی زمانہ میں کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آباد ہو گئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا کے دوست ڈاکٹر حکیم مفتی غلام رسول اور لکھنا اپنی والدہ سے سیکھا جو ایک نیک دِل اور شریف النفس خاتون تھیں لیکن باقاعدہ طور پر درس وتدریس کا سلسلہ انگلستان کی کلیسائی تبلیغی انجمن کے چرچ مشن اسکول اور ہائی اسکول امرتسر میں شروع ہوا۔ ہائی اسکول میں ریاضی کے اُستاد ماسٹر شہرت سنگھ سے گلستان بوستان، شاہنامہ، سکندر نامہ، مثنوی مولانا روم اور حافظ وغیرہ کا درس لیا۔ یہیں سے صوفی تبسم نے شعروشاعری سے دلچسپی لینا شروع کی۔ بعد میں اسی اسکول کے ایک اور استاد قاضی حفیظ اللہ کے ذریعے سے پہلی بار ظفر علی خان، اکبرالہ آبادی، حسرت موہانی اور اقبال کے نام اور کلام سے واقفیت حاصل ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد خالصہ کالج امرتسر میں داخلہ لیا اور پھر ایف، سی کالج امرتسر سے بی۔اے کیا۔ اسکے بعد بی ٹی اور ایم، اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ شروع میں گورنمنٹ اسکول میں مدرس ہوئے۔ بعد میں مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے۔ عربی

اور فارسی میں اچھی دستگاہ حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ فرانسیسی زبان بھی سیکھتے رہے۔

صوفی تبسم کے والد نانبائی کی دوکان کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ صوفی کپڑے کا کاروبار کرے لیکن ان کی طبیعت پڑھنے اور پڑھانے کی طرف مائل تھی۔ اس لئے والد کے ارمان پورے نہ کر سکے بلکہ ملازمت اختیار کرلی اور زندگی بھر اُردو اور فارسی کا درس دیتے رہے۔

بچپن سے ہی صوفی کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح مختلف اخبارات اور جرائد کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس طرح سے انہیں شروع سے ہی روزنامہ زمیندار، الہلال، دلگداز وغیرہ کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ انہی رسائل وجرائد اور کتابوں کا فیضان تھا کہ اُن کے ذوق ادب میں نکھار آگیا۔ صوفی کے ہم درس ڈاکٹر تاثیر اور بشیر ہاشمی تھے۔ جن کی صحبت نے اُن کے ذوق شعر کو جلا بخشی۔ صوفی زندہ دلان پنجاب اور نیاز مندان لاہور جیسی انجمنوں کے رکن تھے جہاں محفل شعر و ادب ہوا کرتی تھی۔ ان محفلوں نے ان کے ذوق سلیم کو اور بھی نکھار بخشا۔

صوفی تبسم اُردو فارسی اور پنجابی تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے ان کی کئی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں جن میں انجمن، جھولنے، علامہ اقبال وغیرہ اہم ہیں۔ ایک اور کتاب ''سراپردۂ افلاک'' بھی چھپ چکی ہے۔ جس میں اقبال کے ''جاوید نامہ'' کے بعض حصوں کا منظوم ترجمہ شامل ہے۔ صوفی تبسم نے طویل عمر پائی۔ اُنہوں نے 1978ء میں انتقال کیا۔

صوفی تبسم کو شروع سے ہی اُردو شاعری سے دلچسپی تھی۔ ابتداء میں فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، بعد میں اُردو کی طرف رجوع ہوئے اور غزل، قطعہ، نظم، رُباعی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ ساتویں جماعت میں ہی مدرسے میں ایک اُستاد اخبار ''زمیندار'' میں چھپی ہوئی نظم کے معنی سب سے پہلے اُنہیں سے پوچھتے تھے۔ اس کا ذکر خود صوفی تبسم سے سنئے۔

''قاضی صاحب شاعر اور ادیب تھے۔ اُن کے ادبی ذوق کا یہ عالم تھا کہ صبح سویرے کلاس میں آتے تو ''زمیندار'' اخبار کا پرچہ ساتھ لاتے، زمیندار کے پہلے صفحے پر بالعموم نظم

ہوتی تھی۔ وہ پڑھ کر سناتے اور پھر مجھ سے پوچھتے (اس لئے کہ مجھے شعر سے شغف تھا) کہ کیسی نظم ہے۔ میں نے ظفر علی خان، اکبرالہ آبادی، حسرت موہانی اور اقبال کے نام سب سے پہلے اُنہیں سے سنے۔''(۱) لیکن طبیعت جب شعر کہنے پر اُکساتی فارسی کے شعر ہو جاتے تھے فارسی سے اس قدر دلچسپی ہوگئی کہ بڑے بڑے اُستادوں کے شعر نہیں جچتے تھے۔ چنانچہ اُردو کو چھوڑ کر فارسی کی طرف مائل ہوئے۔ یہ حضرت فیروز طغرائی کے تلامذہ کا اعجاز تھا۔(۲)

صوفی تبسم نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت کم لکھا لیکن اُن کے یہاں اُستادانہ جوہر ملتا ہے۔ اُن کا اصلی میدان غزل ہے۔ اُنہوں نے نہایت سادگی اور صفائی سے غزل میں اپنی انفرادیت منوائی ہے۔ ''جدید شعراء اردو'' کے مرتب ڈاکٹر عبدالوحید لکھتے ہیں:۔

> ''اُن کی غزل میں جتنی حسن و عشق کی رنگین داستان ہے۔ تقریباً اتنی ہی حساس اور دردمند دل کی کہانی ہے۔ آج کے بدلے حالات میں غمِ عشق کے ساتھ غمِ روزگار کا بیان ناگزیر سا ہوگیا ہے مگر تبسم صاحب ان جذبات وخیالات کو جس سادگی وصفائی، نغمگی وترنم اور لطافت وشیرینی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اُس سے اُن کے اسلوب بیان میں ایک امتیازی شان پیدا ہوگئی ہے۔''(۳)

صوفی تبسم کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کا انداز بعض اوقات لکھنوی دبستان کے قریب آجاتا ہے لیکن وہ محض جسم اور جنس کی شاعری نہیں کرتے۔ اُنہوں نے طویل اور مختصر دونوں بحور میں شعر کہے ہیں۔ ان کے تغزل میں ایک عجیب گھلاوٹ اور رسیلے پن کا بھی احساس ہوتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ماہنامہ ''نقوش'' لاہور (آپ بیتی نمبر) ص 1094 جون 1964

(۲) ایضاً ص 1095

(۳) ڈاکٹر عبدالوحید (مرتب) جدید شعرائے اُردو ص 686-685

جب خواب میں ہوتی ہے دنیا اس وقت دلِ بے تاب میرا
اک شعلہ سا بن جاتا ہے اور پہروں تک تڑپاتا ہے

دل کو جب بے کلی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

آہوں کے نغمے اشکوں کے تارے
کتنے حسین ہیں غم کے سہارے

چھوٹا سا اک دِل الفت کی دولت
کیا کوئی جیتے کیا کوئی ہارے

ہزار گردش شام و سحر سے گزرے ہیں
وہ قافلے جو تری رہگذر سے گزرے ہیں

شجر شجر نگراں ہے کلی کلی بیدار
نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار

ذکر ہو چکا ہے کہ صوفی تبسم نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ خاص طور پر ان کے یہاں نظموں، قطعات اور رُباعیات کی خاصی تعداد ملتی ہے۔ اُن کی نظموں میں مایوسی اور افسردگی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ اُمید اور آئندہ مستقبل کی بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کی نظم ہو یا رُباعی، اقبال کے اثرات جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

صوفی تبسم نے مقابلتاً بہت کم کہا ہے لیکن جو کچھ بھی کہا ہے سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ اس میں نہ صرف اُن کے جذبے کی آنچ ملتی ہے بلکہ فکر و فن کے اعتبار سے استادانہ شان بھی ٹپکتی ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کا جلال و جمال ملتا ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی غم عشق کے ساتھ ساتھ غم روزگار کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں خاص طور پر صفائی، سادگی، لطافت اور مٹھاس ملتی ہے۔ جس سے وہ دوسرے شعراء کے مقابلے میں ایک منفرد حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ صوفی تبسم کے یہاں تغزل کا حسن بھی ملتا ہے۔ خاص طور پر ایسی غزلوں میں جو چھوٹی بحور میں ملتی ہے۔ اس رنگ تغزل پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالوحید لکھتے ہیں:۔

"اُن کے تغزل میں ایک ایسی گھلاوٹ اور سریلا پن پایا جاتا ہے۔ جس میں کہیں کہیں گیتوں کا سارس اور لوچ ہے۔" (۱)

صوفی تبسم بچوں کے شاعر بھی ہیں۔ اُن کا ایک مجموعہ "جھولنے" بچوں کی شاعری سے

متعلق ہے۔ یہ ایک ہلکی پھلکی کتاب ہے۔ جسکا مقصد بچوں کو بہلانا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں اخلاقی درس بھی دینا ہے۔ اپنی نظموں میں صوفی ایک عجیب وغریب اور خوبصورت دنیا میں داخل ہوئے ہیں اور بچوں کی نفسیات کے پیش نظر بچوں کے اخلاق کی باتیں کرتے ہیں۔ فنی لحاظ سے ان اشعار میں وہی پختگی ملتی ہے جو ان کی غزلوں اور نظموں میں نظر آتی ہے۔ پطرس بخاری اس کتاب کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:۔

> ''یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دِن ہے اور یوں اتوار منانے میں انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ کا تتبع کیا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھتے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد اس میں جا بجا اس کو نظر آئیں گے۔'' (۲)

صوفی تبسم ہماری محفل شعر کے ایسے سخن ور ہیں جنہوں نے اُردو اور فارسی شاعری میں امتیازی شان برقرار رکھی۔ وہ اپنے معاصرین کی طرح اقبال کے عاشق تھے۔ انہوں نے اقبال کے فکر ونظر سے حتی الوسیع استفادہ کیا تھا حتیٰ کہ جاوید نامہ کے بعض حصوں کا منظوم ترجمہ ''سراپردہ افلاک'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ اُن کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ اقبال پر ان کی نظم بھی ان کی عقیدت اور احترام کی یادگار ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اس کی آواز سے پھر زیست کا نغمہ اُبھرا
ہر رگ ساز میں اک تازہ نوا جاگ اٹھی

---

(۱) ڈاکٹر عبدالواحد: جدید شعرائے اردو، ص ۴۸۶

(۲) صوفی تبسم: جھولنے (دیباچہ) بحوالہ نقوش لاہور، پطرس نمبر ۷۵، ۷۶، ستمبر ۱۹۵۹ء

وہ چلا وہ کہ کھلیں راہ رووں کی آنکھیں
کارواں چونک پڑا بانگ درا جاگ اٹھی

صوفی تبسم اور اقبال کے تصورات میں جو مماثلت پائی جاتی ہے۔اس کا ایک اجمالی جائزہ ملاحظہ فرمایئے:

اقبال کے تصورات میں ایک اہم تصور مردِ مومن کا تصور ہے۔ اقبال کے نزدیک مردِ مومن انسانیت کا مکمل نمونہ ہے اور محنت، سخن کوشی، قربانی اور ہمدردی کا مجموعہ ہے۔ جس کا مقابلہ نٹشے کا Superman بھی نہیں کرسکتا۔ اگر اس تصور کے قریب کوئی انسانی نمونہ ہے تو وہ مردِ کامل ہے جو اسلامی دور کے آغاز میں نظر آتا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن مکمل ایمان والا ہے اور اسی ایمان کی مثال سے دُنیا کی رہبری کرتا ہے۔ وہ اپنی بات کسی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لئے منوانا نہیں چاہتا بلکہ اس کے پس پشت رضائے الٰہی ہے۔ اقبال کا یہ تصور اس زمانے میں سامنے آیا۔ جب وہ اپنے ہم وطنوں کو فرنگی زنجیروں میں بندھا ہوا پاتے ہیں اور اپنے شعروں کے ذریعہ سے ان زنجیروں سے رہائی کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔ اقبال کو اس بات کا ملال تھا کہ وہ جس قوم اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی زمانے میں عروج کی بلندی پر تھی اور دنیا کو روشنی دے رہی تھی لیکن اپنے سارے جلال کو کھول کر وہ زوال کی پستیوں میں آچکی ہے۔ چنانچہ وہ پھر اُسی ترقی کے زمانے کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں اور اسی سے احساس اور جذبے کی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کا مردمومن اسی جذبے کو استوار کرنے کے لئے خلق ہوتا ہے۔ وہ حکیمانہ نگاہ کا مالک ہے اور کائنات کی دولت اس کی ٹھوکروں میں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی بے نیازی اور ایمان کی دولت ہے۔ وہ نیابت الٰہی کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے اور محبت اور عشق کی کامرانیوں سے بھی سرفراز ہے۔ وہ درویش کی قناعت اور سپاہی کا جگر رکھتا ہے اور انہی صفات سے اپنی قوم کے کردار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال کے کلام میں یہ تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کارکشا کارِساز
اُس کی اُمیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دِل نواز
نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم، پاک دِل وپاکباز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

صوفی تبسم، اقبال سے متاثر تھے۔اس کا بین ثبوت اُن کے نظریات اور تصورات ہیں جن میں علامہ کے اشعار کے ساتھ مماثلت نظر آتی ہے۔صوفی نے بھی مردِ مومن کے تصور پر غور کیا ہے اور اُن کے کئی اشعار اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے ملتے ہیں۔صوفی کے مطابق مردِ مومن کا خمیر کائنات کے اسرار کا دفینہ ہے۔وہ اپنے سینے میں سکون کی جنبش بسائے ہوئے ہے۔وہ قانع اور بے نیاز ہے۔اُس کے سامنے بڑے بڑے شہنشاہوں کا غرور چکنا چور ہوتا ہے اور ملایک کا سر اُس کی نمازوں کے آگے جھک جاتا ہے۔کائنات کے حُسن کے رموز اُس کے جمال میں چھپے ہوئے ہیں۔ایک نظم ملاحظہ کیجئے۔جس میں ان تمام چیزوں کی تفصیل ملتی ہے۔کہتے ہیں۔

تیرے خمیر میں پوشیدہ کائنات کا راز
تری نظر میں دوعالم کی وسعتیں پنہاں

سکون کی جنبش آسودہ تیرے سینے میں
تری جبیں پہ تری بے نیازیاں رقصاں
ترے خیال سے لرزاں ہے شوکت الوضد
ترے سجود سے ہے سرنگوں سپہر بلند
ترے نیاز سے خائف غرور قیصر وجم
تری نماز کے آگے سر ملائک خم
ترے جمال سے رخشندہ کائنات کاحسن
ترے جمال سے پائندہ عظمت انسان
ترے اک نفس میں نہفتہ حیات نو کی لگن
ہراک نگاہ تری تازہ سرخوشی کی لگن

نگاہ اور نظر اگر چہ کوئی ایک تصور نہیں ہے لیکن کئی شاعروں نے اپنے افکار کے اظہار کے لئے نگاہ اور نظر سے بڑا کام لیا ہے۔ اقبال ایسے ہی شاعر ہیں جنہوں نے اپنے شاعرانہ خیالات اور فلسفیانہ افکار کو بیان کرنے کے لئے نگاہ اور نظر سے کام لیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:۔

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ

تو وہ واضح طور پر نگاہ کی کرامات کا اظہار کرتے ہیں، نہیں وہ نگاہ کو ایک بلند مرتبہ دیتے ہیں۔

اقبال کا اہم تصور، تصور خودی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خودی ہی سے خودشناسی حاصل ہوسکتی ہے اور کائنات کے اصل وجود کو پہچانا جاسکتا ہے۔ پہچان کا یہ آلہ چونکہ خودی ہے جو ایک حقیقت ہے اور یہ خودی نگاہ اور نظر سے ہی حاصل ہوسکتی ہے یعنی جس شخص میں ذوق نظر ہو وہی خودی کی پہچان کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ انسان خودی کے راز کو پہچان کر خدا کی

ترجمانی کرتا ہے۔اس لئے وہ نگاہ اور نظر کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا رازداں ہوجا، خدا کا ترجمان ہوجا

اقبال مردِ مومن کو نہایت اہم سمجھتے ہیں کیونکہ اسی کے ذریعے سے انسانی زندگی کا مقصد پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ مردمومن پر خودی کا راز منکشف ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ قوموں کی تقدیریں بدل سکتا ہے۔جبھی اقبال کہتے ہیں۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال اس لئے نوجوانوں کی تلقین کرتے ہیں کہ وہ نگاہ مردمومن پیدا کردیں۔وہ اپنی قوم کو اپنی تقدیر بنانے کی تلقین کرتے ہیں یا جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ آج کا انسان مادیت کی طرف بڑھتا جارہا ہے اور اپنے اصلی مقصد سے ہٹ رہا ہے تو وہ اسے تلقین کرتے ہیں کہ اگر وہ نگاہ مردمومن پیدا کرے تو اس کی رسائی خدا تک ہوسکتی ہے۔ایک جگہ کہتے ہیں:۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
دیکھئے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے

نگاہ اور نظر کے معاملے میں اقبال جب اہل نظر اور کور نظر کا مقابلہ کرتے ہیں تو صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ یہ نگاہ اور نظر کا اعجاز ہے کہ دیکھنے والی شئے کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔اگر نظر نہیں ہے تو ہمیشہ قدم قدم پر دھوکہ کھانے کا خطرہ رہتا ہے۔لہٰذا اقبال ہمیشہ فریب نظر سے بچنے کا درس دیتے ہیں وہ کہتے ہیں:۔

مجھ کو تو یہ دُنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا
ممکن ہے کہ تو جس کو سمجھتا ہے بہاراں

اوروں کی نگاہوں میں وہ موسم ہو خزاں کا
نگاہ وہ نہیں جو سرخ وزرد پہچانے
نگاہ وہ ہے کہ محتاج مہر وماہ نہیں
نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب ونظر کی رسوائی

نگاہ اور نظر کا تصور صوفی تبسم کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اقبال کے خیالات کے قریب اُن کے خیالات بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں اقبال کہتے ہیں کہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگین ہے بزم جانانہ

صوفی تبسم پکار اُٹھتے ہیں:۔

جہاں سرور میسر تھا جام ومے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

صوفی تبسم بھی اُسی نگاہ کے قابل ہیں جہاں پروانے شمع کی لو کے بغیر خاکستر ہو جاتے ہیں اور یہ خاک کرنے والی خصوصیت دِل کی آگ ہے۔ اگر چہ صوفی تبسم خودی کی تبلیغ اُسی شدومد اور شدت کے ساتھ نہیں کرتے جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے مگر وہ بھی مردمومن کے قائل نظر آتے ہیں۔ اور مرد مومن کا سب سے پہلا امتیاز خودی ہے۔ صوفی، مرد مومن کی سب سے بڑی خصوصیت دونوں عالموں کی وسعتیں سمیٹنا بتاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بے نیاز ہوتا ہے اور اس کے جمال سے انسانیت کی عظمت زندہ رہتی ہے۔ یہ سب چیزیں نظر کے طفیل حاصل ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ صوفی تبسم کہتے ہیں:۔

تیرے خمیر میں پوشیدہ کائنات کا راز
تیری نظر میں دوعالم کی وسعتیں پنہاں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفی کا مردمومن اہل نظر ہے۔ مثلاً:۔

ہر نظر اک شعلۂ بے نور   ہر نفس ایک ساز بے آہنگ
نگاہ ناز میں دل سوز نیاز کہاں   یہ آشنائے نظر میں دلوں کے بیگانے
جہاں سرور میسر تھا جام و مے کے بغیر   وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں
نہ جانے کونسی منزل پہ جا کے رک جائیں   نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں
وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں   بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

اقبال اور صوفی تبسم دونوں ہی زندگی کے شاعر ہیں۔اس کی وضاحت ان اشعار سے ہوتی ہے اقبال کہتے ہیں:۔

شمع کی طرح جئیں بزم گاہِ عالم میں
خود جئیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

اس سلسلے میں یہ اشعار بھی قابل غور ہیں۔اقبال کہتے ہیں:۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام وسحر سے جاوداں ہوجا
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمان خلیل
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن
برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

صوفی تبسم بھی زندگی کارجائی پہلو ہمیشہ سامنے رکھتے ہیں۔اُن کے یہاں زندگی سے بیزاری کا احساس نہیں ملتا۔اگرچہ انہوں نے اقبال کی طرح راست طریقے سے قرآن اور حدیث کی تفسیر اپنے اشعار میں نہیں کی ہے لیکن زندگی کے بارے میں ان کے نظریات بھی اخلاقی قدروں سے بھرپور ہیں اور ان میں کہیں پر بھی قنوطی انداز کا احساس نہیں ہوتا۔

وہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ موت کو بھی عین زندگی سمجھتے ہیں۔ صوفی تبسم دِل کی آگ سے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع کے جلتے رہے ہیں پروانے
موت کی دھمکیاں نہ دو مجھ کو
موت کیا زندگی نہیں ہوتی
دِل کو جب بے کلی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

صوفی تبسم فنی لحاظ سے بھی اقبال کے قریب ہیں۔ انہوں نے اقبال کی طرح اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ اسی طرح وہ صرف غزل پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ انہوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم، قطعہ، رُباعی وغیرہ ہر صنف میں اچھے شعری نمونے چھوڑے ہیں۔ اقبال کی غزلوں میں تغزل کی چاشنی کے ساتھ ساتھ گیتوں کا رس اور لوچ ملتا ہے۔ صوفی تبسم کے یہاں یہی گھلاوٹ اور سریلا پن ایک جادو جگاتا ہے۔ خاص طور پر ایسی غزلیں جن میں چھوٹی چھوٹی بحور کا التزام کیا گیا ہے صوفی تبسم کی شاعری میں سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہیں۔

اقبال اور صوفی تبسم کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اکثر ایسے کلیدی الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی اہمیت الفاظ سے زیادہ ان کے معنی اور مفاہیم میں ہے۔ مثال کے طور پر زندگی، موت، عشق، حسن، نگاہ، نظر، خودی، کائنات، حیات، شمع، انسان، فنا، بقاء جیسے علائم والفاظ دونوں شعراء کے یہاں بہ کثرت ملتے ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے انداز سے ان الفاظ کا ایسا استعمال کیا ہے کہ معنی کے لحاظ سے لفظ کی سطح بدل جاتی ہے اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ لفظ یقیناً حرکی ہے جو تخلیق کار کے ہاتھوں میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے مثلاً

حسن کے تیور کیا کہیے (صوفی تبسم)
حسن سے عشق کی فطرت کی ہے تحریک کمال (اقبال)
رحیل شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور (صوفی تبسم)
فقط ذوق پرواز ہے زندگی (اقبال)
یہ سیل عشق اوراس پر نظر نظر کا شمار (صوفی تبسم)
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات (اقبال)
سخت بیگانۂ حیات ہے دِل (صوفی تبسم)
حیات ذوق شفر کے سوا کچھ اور نہیں (اقبال)
ہر نظر اک شعلہ بے نور (صوفی تبسم)
نظر کو نظارے کی تمنا ہے (اقبال)

اس کے علاوہ ان دونوں شعراء کے یہاں تشبیہات واستعارات کی مماثلت بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ جن سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صوفی تبسم علامہ اقبال کی شاعری سے کافی متاثر رہے ہیں۔

●●●

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو اُردو کے ایک بلند قامت افسانہ نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے بے شمار افسانے، ڈرامے، خاکے اور مضامین لکھے ہیں۔ اپنی تخلیقات میں اُنہوں نے ہر طبقہ کے لوگوں کی نمائندگی کی اور اپنے فن کو زندگی کے قریب لا کھڑا کر دیا۔ وہ ایک بڑے حقیقت نگار تھے۔ جن کی تخلیقات میں سماج کا رستا ہوا ناسور ٹپکتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے معاصرین میں ایک الگ اور انفرادی راستہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ منٹو نے ایک ناول بھی لکھا۔ وہ فلمی کہانیاں لکھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ منٹو نے بحیثیت ایک مترجم کے بھی دُنیائے ادب میں اپنا لوہا منوایا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک افسانہ نگار تھے اور اسی نثری صنف میں اُنہوں نے شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر برج پریمی، جو سعادت حسن منٹو کی

شخصیت اور فن پر پہلی تحقیقی اور جامع کتاب لکھ چکے ہیں (۱) اور برصغیر ہند و پاک کے علمی وادبی حلقوں میں ماہر منٹویات کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، منٹو کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سعادت حسن منٹو ایک عظیم فنکار ہیں۔ ان کی عظمت کا ایک زبردست ثبوت یہ ہے کہ اُن کی شخصیت اور فن اپنے معاصرین اور متاخرین کے لئے بے حد متنازعہ فیہ رہا ہے۔ اُن کے بیشتر افسانوں نے بحث و تمحیص کے دفتر کھول دیئے۔ بعض نقاد ان فن نے ان کو محض عریاں نگار اور فحش نگار قرار دے کر رد کر دیا اور بعضوں نے ان میں فنکاری نے اعلیٰ نمونے تلاش کئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں

---

(۱) ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب ''سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے'' پر مشاہیر ادب کی آرا

- پروفیسر آل احمد سرور: ڈاکٹر برج پریمی نے اُردو زبان وادب کی تدریس اور تنقید کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ اُن کی اہمیت مسلم ہے۔ منٹو پر اُن کی کتاب ایک بڑے فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔
- پروفیسر گیان چند جین: آپ کی کتاب ''سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے'' ملی۔ کتاب خوب سے خوب تر ہے۔ بہت مفصل جامع اور تحقیقی۔ آخری جزو ''سعادت حسن منٹو۔ ایک نظر میں'' بیت الغزل ہے۔ کوزے میں دریا بھرنا اسی کو کہتے ہیں۔
- پروفیسر محمد حسن: برج پریمی کی یہ کتاب ابھی تک منٹو پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اُردو کے افسانوی ادب کے ہر طالب علم کیلئے لائق مطالعہ ہے۔
- وارث علوی: منٹو کی زندگی اور کارناموں پر پہلی تحقیقی اور جامع کتاب ڈاکٹر برج پریمی نے لکھی۔
- پروفیسر گوپی چند نارنگ: برج پریمی کا کام منٹو پر بنیادی نوعیت کا ہے۔ منٹو کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص مرحوم برج پریمی کے کام سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔
- کشمیری لال ذاکر: اتنی خوبصورت کتاب پر اپنے کم سے کم ایک درجن ناول قربان کر سکتا ہوں۔
- محمد یوسف ٹینگ: افسوس کہ دوسرے کشمیری دیوزادا اقبال پر کوئی اس پائے کی کتاب نہیں لکھ سکے بہر حال منٹو شناسی کی اس کتاب کے بل بوتے پر ہم سرخرو ہو گئے ہیں۔
- حمیدہ معین رضوی (پاکستان کی معروف خاتون افسانہ نگار حال برطانیہ) جتنا وسیع اور وقیع کام برج پریمی نے منٹو پر کیا ہے، اُتنا پاکستان میں بھی کسی نے نہیں کیا۔

سماجی، ذہنی اور فکری زندگی کی عکاسی کی ہے اور ہندوستانی سماج میں رستے ہوئے ناسوروں پر نشتر رکھ دیئے ہیں'' (۱)

سعادت حسن منٹو ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء میں سمبرالہ ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولوی غلام حسن منٹو پیشے سے سب جج تھے اور عوام میں عزت وتوقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ایم اے او مڈل سکول میں اُنہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ شریف پورہ امرتسر کے مسلم اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندو سبھا کالج امرتسر میں داخلہ لیا، جہاں اُن کے استاد مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض تھے۔ اس بات کا انکشاف فیض کے اُس خط سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے اپنی اسیری کے دوران منٹو کے انتقال پُر ملال کی خبر سن کر اپنی رفیقۂ حیات کے نام لکھا۔ خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''منٹو کی وفات کا سُن کر بہت دکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے۔ اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے اگر یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی، اس لئے کہ وہ کلاس میں شاید ہی آتے ہوں البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف، فرائڈ اور موپاساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔ (۲)

یہ وہ زمانہ تھا جب منٹو تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسرے مشاغل میں بھی حصہ لینے لگے۔ پڑھنے سے اُن کی دلچسپی کم ہونے لگی اور وہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اُن کی طبیعت اُوب گئی۔ وہ جوئے، قمار بازی اور آوارہ گردی کی طرف مائل ہونے لگے اور وہ تکیوں اور قبرستانوں میں گھومنے لگے۔ چرس اور شراب اُن کی غذا بن گئی۔ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

(۱) سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے از ڈاکٹر برج پریمی ص ۱۰

(۲) چلیں میرے دریچے میں از فیض احمد فیض ص ۲۲

''یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے آوارہ گردی شروع کردی تھی۔
طبیعت ہر وقت اُچاٹ سی رہتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کدُ بُد ہر
وقت دِل ودماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز بھی
سامنے آجائے، اسے چکھوں، خواہ وہ انتہائی درجے کی کڑوی ہی
کیوں نہ ہو۔'' (۱)

منٹو کو پڑھنے لکھنے کی طرف شروع سے ہی دلچسپی تھی۔ لیکن اُن کا یہ شوق صرف جاسوسی ناولوں کے مطالعے تک ہی محدود رہا۔ وہ نصابی کتب کا مطالعہ کرنے سے ہر بار گریز کرتے تھے۔ چنانچہ بار بار اسکول سے بھاگ جاتے تھے اور آوارہ گردی کرتے رہتے تھے۔ اُن کی شرارتوں اور شوخیوں میں دِن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ حتیٰ کہ ایک زمانے میں وہ ٹامی (۲) کے نام سے پکارے جانے لگے۔

آخر امرتسری ایک دِن اُن کی ملاقات اپنے ایک دوست کی وساطت سے باری علیگ سے ہوئی۔ وہ ایک اشتراکی ادیب تھے۔ اُنہیں صحافت کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور روسی ادب سے زبردست دلچسپی تھی اور وہ حاجی لق لق کے ساتھ اخبار مساوات امرتسر میں کام کرتے تھے۔ اُنہیں منٹو کے اندر حقیقی فنکار نظر آنے لگا۔ اس لئے اُنہوں نے منٹو کو خبروں کے ترجمے کا کام سونپ دیا۔ یہیں سے منٹو کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ منٹو اس پر خود اپنی کتاب گنجے فرشتے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''آج کل میں جو کچھ ہوں اس کو بنانے میں سب سے پہلا
ہاتھ باری صاحب کا تھا۔ اگر امرتسر میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی
اور متواتر تین مہینے میں اُن کی صحبت میں نہ گذرے ہوتے تو یقیناً
میں کسی اور راستے پر گامزن ہوتا۔'' (۳)

(۱) لاؤڈ اسپیکر از سعادت حسن منٹو ص ۲۰۲ بحوالہ سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے ص ۳۸
(۲) گنجے فرشتے: سعادت حسن منٹو ص ۲۲

(۳) سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے از ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۲۸

منٹو کے والد ۱۹۳۳ء میں ستر سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُس وقت منٹو کی عمر صرف ۲۱ سال تھی۔ والد کے انتقال کے بعد منٹو پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے منڈلانے لگے۔ اُنہیں ذریعہ معاش کی تلاش میں دردر بھٹکنا پڑا۔ آخر وہ اپنے ایک دوست مظفر حسین شمیم کی سفارش پر ۴۰ روپے ماہوار تنخواہ پر ''پارس'' کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوئے لیکن پرچے کی پالیسی سے منٹو خوش نہیں تھے لہٰذا وہ جلد ہی اس پرچے سے بے دخل ہو گئے۔ منٹو کو بچپن سے ہی فلمی دُنیا سے لگاؤ تھا وہ شروع سے ہی اپنے کمرے کی دیواروں پر فلمی اداکاروں کی تصویریں سجا سجا کر رکھتے تھے۔ ڈراموں کو اسٹیج کرنا چاہتے تھے۔ اُنہیں موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ دراصل اُن کے اندر ایک حقیقی فنکار چھپا ہوا تھا۔ منٹو نے بہت سی فلمی کہانیاں اور منظر نامے لکھے جن میں مجھے پاپی کہو، کسان کنیا، چل چل رے نوجوان، بیگم، کیچڑ، شکاری، آٹھ دن، گھمنڈ، دوسری کوٹھی وغیرہ اُن کی کامیاب فلمیں ہیں۔ مرزا غالب بھی منٹو کی ایک کامیاب فلم ہے، جس کو معروف ہدایت کار اور فلم ساز سہراب مودی نے منٹو کے انتقال کے بعد فلمایا۔

سعادت حسن منٹو کے آباءواجداد کشمیری تھے۔ وہ کشمیری پنڈتوں کے سرسوتی برہمن کی شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور کسی زمانے میں وادی کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آباد ہو گئے تھے۔ منٹو کو اپنے کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

- ''میں کشمیری ہوں۔ بہت عرصہ ہوا ہمارے آباءواجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور مسلمان ہو گئے۔'' (۱)
- ''کشمیر میں نے نہیں دیکھا ہے لیکن کشمیری دیکھے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے مہجور کو نہیں دیکھا ہے۔ (۲)

منٹو نے کشمیر اپنی کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ وہ بٹوت تک گئے تھے جہاں سنی ٹوریم

(۱) بحوالہ اُردو تھیٹر حصہ سوم، ڈاکٹر عبدالحلیم نامی ص ۲۰۷

(۲) منٹو کتھا: از ڈاکٹر برج پریمی ص ۸۰

میں تپ دق کا علاج کرنے کے لئے اُن کا صرف تین ماہ تک قیام رہا۔ بٹوت میں اُن کا پہلا عشق پروان چڑھا۔ وہ بیگو نامی ایک چرواہن سے عشق کرنے لگے بعد میں انہوں نے اسی عنوان سے اپنا ایک قابل قدر افسانہ لکھا۔ قیام بٹوت کے دوران میں اُنہوں نے وہاں کے پس منظر میں اور بھی بہت سے افسانے لکھے۔ جن میں ایک خط، مصری کی ڈلی، موسم کی شرارت، لالٹین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام افسانے اُن کے تصورِ عشق کی غمازی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی۔ منٹو کے اُس دور کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

> ''بٹوت کے قیام کے دوران منٹو کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا اُن کی ملاقات بیگو نامی ایک چرواہن سے ہوئی۔ یہ ملاقات جلدی ہی عشق میں تبدیل ہوگئی۔ اس عشق کی پرچھائیاں اُن کے بہت سے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ایک خط، بیگو، مصری کی ڈبی، موسم کی شرارت، لالٹین وغیرہ میں اس معصوم محبت کی جھلکیاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ یہ افسانے اُن کے تصور عشق کے بعض اہم گوشے نمایاں کرتے ہیں۔''(۲)

منٹو ایک حقیقت پسند فنکار تھے۔ ان کے افسانے حقائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ فرضی قصوں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دینے کے قائل نہیں۔ اُنہوں نے زندگی کے زہر کو امرت سمجھ کر پی لیا تھا۔ اسی لئے اُن کے افسانے حقیقت کے قریب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی، منٹو کے افسانہ نگاری کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ ابتداء سے ۱۹۳۷ء تک ہفت روزہ مصور بمبئی کی ادارت تک منٹو کی ادبی زندگی کا پہلا دور متعین کرتے ہیں۔ اس دور میں منٹو کو باری علیگ کی رہنمائی حاصل تھی۔ اُردو کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور روسی ادب کے ساتھ اُن کی گہری دلچسپی تھی۔ اس دور میں اُنہوں نے بہت سے فرانسی اور روسی فن پاروں کو اُردو میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بے شمار افسانے لکھے۔

(۱) سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے۔ از ڈاکٹر برج پریمی ص

منٹو کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک متعین ہوتا ہے۔ اس دور میں اُن کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ اس دور میں اُنہوں نے سماج کے مختلف طبقوں کے لوگوں کو قریب سے دیکھا اور اُن کے حالات کو اپنے تخلیقی جوہر سے اپنے افسانوں میں سمویا۔

منٹو کے افسانہ نگاری کا تیسرا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک کے ادب پر محیط ہے۔ وہ تقسیم ملک سے خوش نہیں تھے۔ وہ قتل وغارت، خون ریزی، جنگ وجدل، بربریت اور مار ڈھارڑ کے خلاف تھے۔ انہوں نے اپنے اس دور کے افسانوں میں نہایت ہی بلیغ انداز میں اپنے موقف کو بیان کیا ہے اور سیاسی بازی گروں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس ضمن میں اُن کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ ملک کے بٹوارے پر آنسو بہاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

> "سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بے دردی سے بہایا جارہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے ہیں۔" (۱)

ایک اور جگہ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

یہ مت کہو کہ ایک لاکھ مسلمان اور ایک لاکھ ہندو مرے۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح سے ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہوگیا۔ مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہے جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب کا شکار کیا جاسکتا ہے۔ مذہب، دین، دھرم، ایمان،

(۱) گنجے فرشتے از سعادت حسن منٹو۔ ص ۲۶

یقین، عقیدت یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔ چھرے، چاقو یا گولی سے فنا نہیں ہوسکتا۔(۱)

منٹو کی افسانہ نگاری کا چوتھا اور آخری دور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک محیط ہے۔ اس دور میں اُن کے افسانے انسانی زندگی کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ وہ حقائق بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اُن کے بعض افسانے معتوب قرار دیئے گئے۔ جن میں کالی شلوار، بُو، ٹھنڈا گوشت، دھواں، اوپر نیچے درمیان، اور کھول دو وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ٹھنڈا گوشت فنی لحاظ سے مکمل افسانہ ہے۔ کھول دو، بٹوارے کے پس منظر میں لکھی گئی ایک بہترین کہانی ہے۔ ۱۹۱۹ء کی ایک بات کا موضوع قومیت اور وطنیت ہے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کشمیر کے موضوع پر منٹو کا لکھا ہوا ایک جاندار افسانہ ہے۔ چند اقتباسات:۔

> ''ساری رات اندھیری کو اس کے بدن سے عجیب وغریب قسم کی بُو آتی تھی۔ اس بُو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبو تھی۔ وہ تمام رات پیتا رہتا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اسکے پیٹ سے ہر جگہ سے یہ بُو جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی۔ رندھیر کے ہر سانس میں موجود ہوتی تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہر گز ہر گز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی۔ اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بُو نہ آتی۔ یہ بو جو اس کے دِل و دماغ کے ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی۔ اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رُچ گئی تھی۔'' (بُو)

> ''سلطانہ چپ ہو رہی چنانچہ آخری کنگھی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی پیٹ بھی تو آخر کسی میلے سے بھرنا تھا۔ جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن

(۱) خالی بوتلیں خالی ڈبے از منٹو۔ ص ۲۳

خرچ سے چوتھائی سے بھی کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

خدا بخش بھی سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا دکھ تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔" (کالی شلوار)

"اب اسے اپنے ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا جو کبھی اس کا ہمسایہ تھا۔ جس کے خاندان سے اس کے خاندان کی پشت رہا پشت کے دیرینہ مراسم تھے اب اُس کا وطن وہ تھا جس کا پانی تک بھی اُس نے کبھی نہیں پیا تھا۔ پر اب اُس کی خاطر ایک دم اُس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دیا گیا تھا کہ جاؤ یہ جگہ جہاں تم نے ابھی گھر کے لئے دو اینٹیں بھی نہیں چنیں۔ جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزہ بھی ابھی تک تمہارے منہ میں ٹھیک طور نہیں بیٹھا تمہارا وطن ہے۔ (آخری سلوٹ)

منٹو اُردو کے ایک عظیم افسانہ نگار تھے۔ وہ ۱۹۵۵ء میں صرف ۴۲ سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے۔

●

والد محترم۔ ڈاکٹر برج پریمی کو شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی سرینگر سے "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" پر ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس کے تقریباً ۱۰ سال کے بعد ۱۹۸۶ء اُن کا یہ تحقیقی کام منظر عام پر آیا۔ چونکہ منٹو کی زندگی کا بیشتر حصہ پاکستان میں گذرا تھا۔ اُن کی بیشتر کتابیں اور مختلف رسائل و جرائد کے خاص نمبرات پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن دنوں ہندوپاک کے سیاسی تعلقات کشیدہ تھے۔ منٹو کے بارے میں کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ رسائل و جرائد میں بعض مقالات ضرور شائع ہو چکے تھے لیکن برصغیر

ہندوپاک میں منٹو کی شخصیت اور فن پر کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی جس میں منٹو کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہو اور اُردو افسانے میں اُن کی اہمیت متعین کی گئی ہو کیونکہ منٹو کو رجعت پسند، سنکی، پاگل اور لطیفہ باز، قرار دیا گیا تھا۔ جدیدی اُنہیں ترقی پسند قرار دیتے تھے اور ترقی پسند اُنہیں رجعت پسند کہتے تھے اور اُنہیں کسی بھی قیمت پر اپنانے کیلئے تیار نہیں تھے۔ برج پریمی، منٹو کے اوّلین نقاد اور محقق تھے جنہوں نے اُنہیں صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی، جس کی تصدیق برصغیر ہندو پاک کے معتبر نقادوں اور منٹو کے معاصرین نے بار بار کیا ہے۔

اُن کا عام طور پر یہ طریقہ کار رہتا تھا کہ وہ پہلے کسی بھی ادبی یا تاریخی معاملے کی تہہ تک جاتے تھے۔ پھر تواریخی تناظر میں اُس کو جانچتے اور پرکھتے تھے اس کے بعد تحریر میں لانے کی سعی کرتے تھے۔ یہی طریقہ کار اُنہوں نے منٹو کی بازیافت میں بھی روا رکھا۔ اس تحقیقی مقالے میں انہوں نے جہاں تواریخی شواہد کو بھی خاطر میں لایا وہاں تحقیق کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ امرتسر، بمبئی، دہلی اور لاہور میں جہاں منٹو نے اپنی زندگی کے ایام گذارے، والدِ محترم کو اپنے تحقیقی مراحل طے کرنے کے دوران وہاں جانے کا موقعہ بہت کم ملا بلکہ اُنہوں نے منٹو کے عزیز واقارب سے رابطہ قائم کر کے اپنے مطالعے اور مشاہدے سے منٹو کے خدوخال اُبھارے۔ ان خطوط میں وہ منٹو کے معاصرین اور اُن کے عزیز واقارب سے استفسارات کرتے رہے اور ان سے منٹو کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کے حوالے سے واضح جوابات طلب کرتے تھے۔

اُنہوں نے اُس زمانے میں احمد ندیم قاسمی، ابوسعید قریشی، نور جہاں، اداکار اشوک کمار، صفیہ منٹو، ضیا عظیم آبادی، حامد جلال، اداکار پران، محمد طفیل، دیوان سنگھ مفتون، اداکارہ نرگس دت، اوپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، آل احمد سرور، سلام مچھلی شہری، خوشتر گرامی، آغا خلش کاشمیری، راجہ مہدی علی خان، حسن عباس، قرۃ العین حیدر، سردار جعفری، کرشن چندر، کوثر چاند پوری، فیض احمد فیض، نصیر انور، حبیب کیفیوی، مجروح

سلطانپوری، آغا جانی کاشمیری وغیرہ جیسے ادیبوں اور منٹو کے معاصرین کے ساتھ خط وکتابت کی۔اس طرح سے ہمارے گھر میں خطوط کا ایک بڑا اسٹاک جمع ہو گیا تھا۔ افسوس کہ ان میں سے بعض خطوط ۱۹۹۰ء میں کشمیر کے دہشت گردانہ حالات کے پیش نظر لاکھوں مہاجرین کے ساتھ ہمارے گھر سے بے گھر ہو جانے کی وجہ سے بہت سارے خطوط اور نادر کتابیں اور مسودات تلف ہو گئے۔ لیکن جو خطوط بچ گئے۔ راقم السطور نے حال ہی میں ''مشاہیر ادب کے خطوط برج پریمی کے نام'' سے کتابی صورت میں شائع کئے۔ جن کی اہمیت مسلم ہیں۔ میں بچپن میں یہ خطوط بار بار پڑھتا تھا اور لطف اندوز ہو جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض خطوط کی عبارت مجھے ازبر تھی۔ چند اہم خطوط کے اقتباسات آپ بھی ملاحظہ کیجئے:۔

صفیہ منٹو:

''مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی چیزوں سے مجھے آج تک کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ کتابیں پاکستان میں بھی چھپتی ہیں اور اسی طرح ہندوستان میں بھی اور ہمیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملتی۔ اس لئے میں اس لکھنے کو کیا سمجھوں۔ ہمارے لئے صرف ایک چیز ضرور چھوڑ گئے ہیں۔ وہ ہے نام اور عزت اور بس۔ جس کے لئے میں اُن کی شکر گذار ہوں۔''

ضیا عظیم آبادی:

''کہانیاں اور مضامین تو انہوں نے ہمیشہ بیچے۔ ادب اور صحافت ہی تو ان کا ذریعہ معاش تھا۔ البتہ بمبئی سے لاہور پہنچنے پر اُن کی تنگ دستی بہت بڑھ گئی تھی اور وہ ضرورتاً نور جہاں سرور جہاں لکھنے لگے تھے۔''

دیوان سنگھ مفتون:

جب وہ دہلی میں تھے تو قریب قریب ہر روز میرے پاس

تشریف لاتے۔ اگر وہ دوپہر کو آتے تو بیر پیتے اور رات کو آتے تو
میرے ساتھ برانڈی پیتے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری ہی طرح
ایک پیگ سے زیادہ نہ پئیں مگر وہ کنٹرول میں نہ رہ سکتے تھے۔

محمد طفیل مدیر نقوش لاہور:

ترقی پسندوں نے ان کو رجعت پسند قرار دیا اور روایت
پرستوں اور ادبی ملاؤں نے اُنہیں عریاں نویس کہا، حتیٰ کہ انجمن ترقی
پسند مصنّفین پاکستان نے ان کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ پاکستان سے کوئی خط آجاتا تھا تو سی آئی ڈی محکمہ حرکت میں آجاتا تھا۔ میں اکثر سوچنے لگتا تھا کہ منٹو ایک امن پسند فنکار تھے۔ اُنہوں نے ہمیشہ انسان دوستی، عالمی برادری، حب الوطنی، اخوت اور بھائی چارے کا درس دیا ہے۔ وہ تقسیم ملک کے خلاف تھے۔ انہوں نے کبھی پاکستان کو ہندوستان سے الگ نہیں سمجھا۔ وہ ہمیشہ اس سرزمین میں رہنے بسنے والے انسان کو انسان سمجھتے تھے اور انہیں کسی بھی مذہب سے نہیں جوڑتے تھے۔ اُن کی زبان پر ہمیشہ وطن دوستی اور عالمی برادری کے نغمے پھوٹتے تھے۔ جس کا وہ بار بار اپنے افسانوں، مضامین اور خاکوں میں ذکر کرتے تھے۔ اس سلسلے میں چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ جن سے منٹو کے موقف کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان
اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ
ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب کا گوشت
پوست چلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے ہندو اور مسلمان
دھڑا دھڑ امر رہے تھے کیسے مر رہے تھے۔ کیوں مر رہے تھے۔ ان
سوالوں کے مختلف جواب تھے۔ بھارتی جواب پاکستانی جواب

انگریزی جواب۔ ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو۔ کوئی کہتا، نہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کیلئے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ (مرلی کی دھن)

''اب اسے اپنے ہم وطن کے خلاف لڑنا تھا۔ جو کبھی اس کا ہمسایہ تھا جس کے خاندان سے اس کے خاندان کی پشت ہا پشت کے دیرینہ مراسم تھے۔ اب اس کا وطن وہ تھا۔ جس کا پانی تک بھی اس نے کبھی نہیں پیا تھا۔ پر اب اس کی خاطر ایک دم اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر یہ حکم دیا گیا تھا کہ جاؤ یہ جگہ جہاں تم نے ابھی گھر کے لئے دو اینٹیں بھی نہیں چنیں۔ جس کی ہوا اور جس کے پانی کا مزا ابھی ابھی تک تمہارے منہ میں ٹھیک طور پر نہیں بیٹھا تمہارا وطن ہے۔''

(آخری سلیوٹ)

''میرا ملک ہندوستان سے کٹ کر کیوں بنا کیسے آزاد ہوا۔ یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ جس طرح میرا ملک کٹ کر آزاد ہوا۔ اسی طرح میں کٹ کر آزاد ہوا ہوں اور چچا جان یہ بات تو آپ جیسے ہمہ داں عالم سے چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیئے کہ جس پرندے کو پر کاٹ کر آزاد کیا جائے۔ اس کی آزادی کیسی ہوگی۔''

(چچا سام کے نام خط)

منٹو کی شخصیت اور ان کے فنی پہلوؤں کے بارے میں والد محترم نے بے شمار مواد جمع کیا تھا۔ سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے کے بعد اُنہوں نے منٹو کتھا کے نام سے ایک اور کتاب لکھی جس کی علمی اور ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ اس میں انہوں نے منٹو کے بارے میں نئے نئے پہلوُ اجاگر کئے ہیں۔ ایک زمانے میں انہوں نے منٹو کے تعلق سے ایک سیریز شروع کی تھی۔ اس سریز کے تحت اُنہوں نے ''منٹو اور کشمیر'' منٹو اور کرشن چندر، منٹو اور نگار خانے، منٹو اور شاعر کشمیر مہجور، منٹو اور باری علیگ، منٹو اور غالب، وغیرہ کے عنوانات سے مقالات لکھتے۔ ان مقالات کو ہندو پاک کے ادبی حلقوں نے کافی سراہا گیا وہ منٹو کے بعصد وسر پہلوؤں کو بھی ضبط تحریر میں لانا چاہتے تھے۔ جن میں منٹو اور میرا جی، منٹو، بیگو اور بٹوت، منٹو اور اُوپندر ناتھ اشک، منٹو اور حب الوطنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان موضوعات کے حوالے سے اُنہوں نے خاکہ بھی تیار کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اُن کے بے وقت انتقال نے اُنہیں ان موضوعات پر لکھنے کی مہلت نہیں دی۔

وہ ۱۹۹۰ء میں صرف ۵۵ سال کی عمر میں اچانک اپنے وطن سے دور جموں میں انتقال کر گئے۔

●●●

اختر الایمان کے خطوط (۱)

عالمی ادب میں مکاتیب نے اپنی ایک الگ حیثیت منوالی ہے۔ اُردو میں بھی مکاتیبی ادب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ غالب، اقبال، مولوی عبدالحق، ابوالکلام آزاد، منٹو، صفیہ اختر، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور بیسیوں اہل قلم نے اپنے نجی خطوط میں نہ صرف اپنے دِل کو لخت لخت کر کے رکھ دیا ہے بلکہ نثر کے اس شعبے میں ایک اہم صنف کا اضافہ کیا ہے۔ ان خطوط سے دل کے نہاں خانوں کی پُر اسرار دُنیا سامنے آجاتی ہے اور مختلف مضامین اور موضوعات پر مختلف شاعروں، دانشوروں اور ادیبوں کے ذاتی خیالات کا بھی احاطہ ہوتا ہے۔ بعض ایسے موضوعات بھی سامنے آجاتے ہیں جن کو مضمون کی شکل میں قلم بند کرنے سے مصنف بھی کبھی کبھی گریز کرتا ہے۔

اختر الایمان بڑے قد کے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یادیں، آبجو، تاریک سیارہ، بنت لِحات، نیا آہنگ اور سروسامان وغیرہ اُن کے بعض ایسے شعری مجموعے ہیں، جن سے ان

(۱) یہ خطوط اختر صاحب نے راقم السطور کے نام لکھے تھے۔

کی شاعری کے ان گنت رنگ روشن ہوجاتے ہیں، یہ رنگ اُنہیں عصر حاضر کے سب سے بڑے نظم نگار شاعر کے طور پر تسلیم کروانے کے لئے کافی ہیں۔ نہ صرف ان کی نظمیں بلکہ ان کے شعری مجموعوں پر لکھے گئے خود ان کے دیباچے، مختلف رسائل واخبارات میں لکھی گئی ان کی نثری تحریریں اوران کی خودنوشت سوانح عمری اس آباد خرابے میں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد خوبصورت نثر بھی لکھتے تھے۔ ان کے تنقیدی شعور اور تحقیقی تجسس کا احساس نہ صرف ان کی فکر انگیز تحریروں سے عیاں ہے بلکہ ان کے ساتھ گفتگو کرنے سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بے پناہ تنقیدی بصیرت کے مالک تھے۔ ان کے خطوط اگرچہ اشاعت کے مراحل سے نہیں گزرے ہیں لیکن راقم السطور کے نام ان کے بعض ایسے خطوط محفوظ ہیں جن سے ان کے اسٹائل، ان کی شاعری کے مختلف مراحل، ان کی جستجو، ان کے ادبی اور خاندانی حالات، ان کی فلمی زندگی کے اہم پڑاؤ اور عصر حاضر کے ایک منفرد انداز کے شاعر میراجی کی شخصیت اور شاعری کے بعض ایسے پہلو سامنے آتے ہیں۔ جو آج تک گوشۂ گمنامی میں پڑے تھے۔ یہ خطوط نہ صرف ان کی شخصیت اور فن پر کام کرنے والوں کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں بلکہ عاشقان اردو کے لئے بھی باعث کشش اور بے حد دلچسپی کے حامل ہیں۔ میرے استفسارات کے جواب میں میراجی کے بارے میں اپنے ایک خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

عزیزم

میراجی سے میرے مراسم ایک خط کے ذریعہ شروع ہوئے تھے۔ ان دِنوں لاہور سے ایک ادبی ماہنامہ ''ادبی دُنیا'' نکلتا تھا۔ مولانا صلاح الدین اس کے نثر کے حصے کے مدیر تھے۔ میراجی کے سپرد نظم کا حصہ تھا۔ میں نے ادبی دُنیا کو ایک نظم 'مجرم' اشاعت کے لئے بھیجی تھی۔ میراجی نے وہ نظم ان الفاظ کے ساتھ واپس کردی تھی۔

''اپنے فرصت کے لمحات میں اس نظم پر نظرِ ثانی کر لیجئے''۔

اس کے بعد میں نے وہ نظم نہ اُنہیں بھیجی نہ اس پر نظر ثانی کی۔ وہ نظم رد ہی کردی، کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں کی۔ بلند آہنگ میں نظم تھی۔ (اختر الایمان)

اختر الایمان ایک ذہن اور منفرد انداز کے فنکار تھے۔ انہوں نے ہمیشہ غیر روایتی اندازِ نظر اختیار کیا ہے۔ اُن کے یہاں موضوع اور ہیئت کے جتنے بھی تجربے ملتے ہیں۔ وہ روایتی انداز سے مختلف ہیں۔ یہی انداز انہوں نے نظم ونثر میں اپنالیا۔ ان کے خطوط میں بھی یہی طریقہ کارفرما ہے۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں نہ صرف میراجی کی زندگی ان کی کثرت مے نوشی، ان کی علالت، ان کے شعری محاسن کا ذکر کرتے ہیں بلکہ ان کی زندگی کی آخری ایام کے بارے میں بھی بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ میراجی کے انتقال پر ملال پر وہ بڑے رقعت آمیز انداز میں لکھتے ہیں:۔

مکرمی پریمی صاحب!

آداب! اس کے بعد جب وہ بیمار ہوئے تو میرے پاس ہی آگئے تھے۔ کثرت شراب نوشی سے اُن کی آنتوں میں زخم ہوگئے تھے۔ آخری زمانے میں ان کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ توازن بگڑ گیا تھا۔ یہ اُن لوگوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے جو آتشک کے مریض ہوں۔ میں نے اُنہیں کے، ای، ایم ہسپتال میں داخل کردیا تھا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ (اختر الایمان)

میراجی جب لاہور چھوڑ کر دلی آگئے تو اُن کے بیشتر اوقات اختر الایمان کے ساتھ ہی گذرتے تھے۔ اس کے بارے میں اختر مرحوم نے اپنے خطوط میں بار بار ذکر کیا ہے۔ علی گڑھ اور دہلی سے ہوتے ہوئے جب اختر (مرحوم) پونے اور بمبئی میں مقیم ہوئے تو میراجی بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ غالباً 1943ء کا زمانہ تھا۔ جب اختر الایمان شالیمار نام کی ایک فلم کمپنی سے وابستہ ہوچکے تھے۔ جہاں اُن کے دوست کرشن چندر بھی تھے اور جوش ملیح

آبادی بھی۔ لٰہذا فلم کے ساتھ ساتھ ادبی محفلوں کا بھی انعقاد کیا جاتا تھا۔ ان محفلوں کے بارے میں بھی اختر مرحوم نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔

میراجی جدید اُردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ اُنہوں نے موضوع، تکنیک اور ہیت کے لحاظ سے اُردو شاعری میں نئے تجربے کئے۔ اُنہوں نے شاعری کے علاوہ مضامین بھی لکھے اور وہ مترجم کے طور پر بھی علمی و ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ اُن کے مضامین میں تنقیدی بصیرت بہ درجہ اُتم پائی جاتی ہے۔ اُن کی تحریروں میں سنجیدگی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ ان تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ راشد اور فیض کی شاعری کو آفاقیت عطا کرنے میں میراجی کی تنقیدوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ میراجی کے مضامین سے ان دونوں شعراء کی عظمت کا احساس پہلی بار ہونے لگا۔ میرے پوچھنے پر اختر مرحوم اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

عزیزم رومانی!

آداب!

تمہارا خط ملا۔ میراجی کے بارے میں کیا لکھوں۔ اردو شاعری میں میراجی کا بہت بڑا مقام ہے مگر شاعری کے ساتھ آپ اُن کی تنقیدوں کو بھی نہ بھولئے۔ فیض اور راشد کی شاعری لوگوں تک پہنچانے اور اس شاعری کو سمجھانے میں اُن کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

(اختر الایمان)

میراجی، ن،م، راشد اور اختر الایمان نے اُردو شاعری میں ہیت اور اسلوب کے بیشمار تجربے کئے۔ ان کے ساتھ ساتھ یوسف ظفر اور مجید امجد نے بھی سنجیدگی سے اس پر عمل کیا اور ایک نئی راہ اختیار کی۔ اسی لئے اُن کے تجربات کو نئی شاعری میں ایک اضافے کی حیثیت ہے۔ اختر نے شعوری طور پر نظم کے ارتقائی تعمیر حسن کو خاطر میں لایا۔ ان کے ہاں نظم

کے پوشیدہ امکانات سے استفادہ کرنے کا عمل ملتا ہے۔ دل شکستگی، کشمکش، غم کی تلخی اختر کی نظموں میں ان تمام باتوں کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ نرگیت اور ڈرامائیت ان کی نظم نگاری کی ایک نمائندہ خصوصیت ہے۔ انہی عناصر کی وجہ سے وہ جدید اُردو نظم کے پیش رو تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں ان چیزوں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

رومانی!

میراجی۔ راشد اور اختر الایمان نئی شاعری کی پیش رو ہیں۔ اس کا فیصلہ تو آپ کے ہم عصر اور پیش رو نقاد کریں گے۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اُردو شاعری کو وہ راہیں اظہار کی دکھائی ہیں۔ جو پہلے لکھنے والوں نے نہیں دیکھی تھیں اور یہی کام میراجی اور راشد نے کیا ہے۔ (اختر الایمان)

23رفروری 1987ء

اختر الایمان شروع سے ہی قدرتی مناظر اور سیر وتفریح کے دلدادہ تھے۔ اپنی فلمی زندگی سے وابستہ ہونے کے بعد انہیں بہت سے خوبصورت مقامات پر گھومنے کا موقعہ میسر ہوا لیکن کشمیر کی خوبصورتی کی جس جذبے سے وہ تعریف کرتے تھے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہیں کشمیر کے ذرے ذرے سے پیار تھا۔ وہ اس کے فلک بوس پہاڑوں جھرنوں اور جھیلوں اور آبشاروں اور سرسبز وشاداب میدانوں سے محبت کرتے تھے۔ وہ کئی بار اپنی فلموں کی شوٹنگ کے سلسلے میں کشمیر کی فضاؤں سے سرشار ہوتے رہے۔ اُنہوں نے ہر بار یہاں کے کلچر، تہذیب وتمدن کو عزیز رکھا۔ وہ اپنی گفتگو میں یہاں کے دوستوں اور عزیزوں کو بے حد یاد کرتے تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور (جو ان دنوں کشمیر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے) میر غلام رسول نازکی، شمیم احمد شمیم، شکیل الرحمٰن اور ڈاکٹر برج پریمی کے علاوہ بہت سارے، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور سیاستدانوں کا ذکر بار بار کیا کرتے تھے۔ وہ

کشمیر کے بعض اچھے ہوٹلوں کا بھی ذکر کیا کرتے تھے۔ کشمیر کی سیر کی تڑپ ان کے دل میں ہمیشہ رہتی تھی۔ اُنہیں کشمیری وازوان پسند تھا۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

برادرم

آداب!

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ کشمیر ان گرمیوں ہی میں آنا چاہتا ہوں۔ میں اوبرائے پیلس میں ٹھہرا کرتا ہوں۔ مگر وہ جگہ اتنی دور ہو جاتی ہے کہ وہاں کے ادیبوں اور دوستوں سے ملاقات مشکل ہو جاتی ہے۔ ایک بار رائل یا گرانڈ کچھ ایسا ہی نام تھا اس ہوٹل کا، بازار میں تھا، مجھے ایک بڑا کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس بار بھی بازار میں ہی کہیں ٹھہرنا چاہتا ہوں تا کہ سب آسانی سے آجا سکیں۔ آپ کوئی صاف ستھرا ہوٹل بتایئے جو بازار میں ہو اور جہاں کشمیری کھانے ملتے ہوں خاص طور پر سیخ کباب وغیرہ۔ میں اچھا ہوں۔ تصویر بھیج رہا ہوں۔ اختر الایمان

7/نومبر 79ء

لیکن اُن کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے کشمیر آنے کا پروگرام طے نہیں ہوا کیونکہ اس بار اُنہوں نے اپنی فلم خود ڈائریکٹ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ایک مختصر خط میں اس کی تفصیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

عزیزم رومانی!

کشمیر آنے کا پروگرام ابھی یوں طے نہیں ہوا کہ جو تصویر میں نے ڈائریکٹ کی ہے۔ وہ اپنی آخری منزلوں میں ہے۔ اس سے نپٹ لوں تو پروگرام بناؤں۔ اختر الایمان

ایک اور مختصر خط میرے فائل میں محفوظ ہے۔ لکھتے ہیں:۔

مکرمی پریمی صاحب!

آداب۔ آپ کا دوسرا خط بھی ملا۔ میں اپنی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں بہت مصروف رہا۔

اختر الایمان

1/ مئی 1978ء

اختر صاحب مخلص، انسان دوست اور ملنسار انسان تھے۔ جب کبھی راقم السطور کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ فراہم ہوا تو وہ نہایت ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ شاعری کے علاوہ دنیاداری کی باتیں بھی کرتے تھے۔ مجھے بھی ان کے خط کا شدید انتظار رہتا تھا۔ اپنے شعری مجموعے ''سروسامان'' کی اشاعت کے بارے میں راقم السطور کے نام اپنے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

عزیزم پریمی رومانی!

آپ کا خط آئے اتنی مدت گزر گئی کہ جواب دیا بھی تو باسی ہوگا مگر جواب واجب ہے اور دے رہا ہوں۔ دلی سے ''سروسامان'' پر خرچے کا تخمینہ منگوایا تھا۔ 23 ہزار روپے سے اوپر ہے۔ کتاب چھپواؤں گا ضرور اب صرف اس گومگو میں ہوں کہ کتاب بمبئی سے چھپالوں کہ دلی سے۔ خیال یہ ہے کہ میں کتاب ہمیشہ اپنی نگرانی میں چھپواتا ہوں۔ دلی سے چھپوالی میں وہاں موجود نہیں رہ سکوں گا۔ مگر کتاب اچھی چھپے گی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ والے اچھا کام کرتے ہیں۔ بمبئی سے چھپوالوں تو ابھی اندازہ نہیں کتاب اتنی ہی اچھی چھپے گی یا نہیں مگر میں موجود رہوں گا کچھ طے پا جائے گا تو آپ کو لکھوں۔

نہیں سوانح لکھنی شروع کی تھی۔ بیالیس صفحہ پر جا کر اٹک
گئی۔ دوسرے کام اتنے نکل آئے کہ توجہ ہٹ گئی۔ ایک دو روز
خیالات مجتمع کر کے پھر لکھنے بیٹھتا ہوں۔
ارچنا (۱) کیسی ہیں میری طرف سے خیریت پوچھئے۔
سلطانہ (۲) اچھی ہیں۔ اختر الایمان
20 رنومبر 1983ء

88ء میں جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تو انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ پچھلے دو تین سال سے بڑے نڈھال رہنے لگے۔ انہیں دِل کا عارضہ لاحق ہوا تھا۔ وہ کافی عرصہ تک بمبئی کے ہسپتالوں کا چکر لگاتے رہے۔ آخر ڈاکٹر کے مشورے پر وہ ہوسٹن (امریکہ) تشریف لے گئے۔ جس کی تفصیل ان کی خود نوشت سوانح ''اس آباد خرابے میں'' میں ملتی ہے۔ اس حال میں بھی وہ اپنے دوستوں مداحوں اور خیر خواہوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ میرے استفسار کے جواب میں اُنہوں نے لکھا:۔

عزیزم پریمی رومانی
آپ کی کوئی خیر و خبر نہیں ملی۔ ممکن ہے آپ نے لکھا ہو مگر خط مجھ تک نہیں پہنچے۔ میرے بارے میں اتنا ہے کہ پچھلے ڈھائی تین سال سخت تکلیف اور پریشانی میں گذرے۔ دل کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کئی مہینے ایک کے بعد ایک، تین اسپتالوں میں گذارے۔ جب خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا تو ڈاکٹر نے مشورہ دیا آپریشن کراؤ۔ دِل کی کئی نالیاں بند ہو گئیں ہیں۔ قصہ مختصر ہوسٹن

(۱) راقم السطور کی رفیقۂ حیات
(۲) اختر صاحب کی رفیقۂ حیات

(امریکہ) گیا اور آپریشن کرایا۔ پانچ بائی پاس(By Pass)
ہوئے اور ایک والو(value) بدلا گیا۔ اب اچھا ہوں۔
میں نے وہ پرانا مکان چھوڑ دیا۔ باندرہ ہی میں ہوں مگر نئے مکان
میں اُٹھ آیا ہوں۔ روی درشن اسی مکان کا نام ہے۔
اس مکان میں سورج کے درشن صبح کو نہیں ہوتے شام کو ہوتے
ہیں۔ سورج کی طرف عمارت کی پشت ہے۔ خیر اپنی خیریت
لکھنا۔ اپنے والد سے میرا اسلام کہنا

اختر الایمان

13 اگست 1988ء

اختر مرحوم کے بے شمار خطوط میری فائل میں موجود ہیں۔ جن کو میں عنقریب ہی ترتیب دے کر شائع کرنے کا پروگرام رکھتا ہوں۔ یہ خطوط اختر صاحب پر کام کرنے والوں کے لئے بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

●●●

محمد حسن کے خطوط

ـــــــ برج پریمی کے نام

پروفیسر محمد حسن اُردو کے ایک مستند ادیب، معروف نقاد اور اعلیٰ پایہ کے محقق تھے۔ اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُس زمانے میں کیا جب ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ مجاز، سبط حسین اور احتشام حسین کی صحبت میں رہ کر وہ اردو زبان کی ترقی وبقاء کے لئے کام کرتے رہے۔ پروفیسر محمد حسن دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے ادیب نقاد، ڈراما نگار اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین استاد بھی تھے۔ لکھنو اور دہلی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو کے ساتھ سالہال تک وابستہ رہنے کے بعد وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ساتھ بھی قلیل مدت تک وابستہ رہے اور اپنی علم ودانش سے طلبا کو فیض پہنچاتے رہے۔

پروفیسر محمد حسن کے ساتھ میرے والد محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی کے گہرے تعلقات

تھے۔ وہ اس زمانے میں شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے۔ پروفیسر محمد حسن پہلے ہی سے ان کی صلاحتوں سے واقف تھے۔ وہ انہیں کافی عزیز رکھتے تھے اور ہمیشہ اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک لانے میں اُنہیں ہمیشہ پروفیسر صاحب کی رفاقتوں کا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ جب یہ تحقیقی مقالہ شائع ہوا تو پروفیسر حسن نے اپنی زریں رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔

> ''برج پریمی نے ''سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو ابھی تک منٹو پر شائع ہونے والے سبھی مضامین اور کتابوں پر بھاری ہے۔ منٹو کے خاندان، اسلاف اور ان کی اپنی شخصیت کے بارے میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے برج پریمی نے بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں جو عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔''

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں فیلوشپ ملنے پر محمد حسن نے کشمیر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا لیکن کشمیر کی یادیں دمِ واپس تک ان کے دل میں تازہ رہیں۔ والد محترم کے نام ان کے متعدد خطوط اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہیں کشمیر کے کلچر تہذیب تمدن اور ادب سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔ ان کا شعری مجموعہ زنجیر نغمہ برسوں پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ایسی کئی نظمیں شامل ہیں جن سے سرزمین کشمیر کی بوباس آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی اشاروں اور کنایوں میں اور کبھی براہ راست وہ کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعے کو کشمیر کی ہی نذر کیا ہے۔ اس بات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر انہیں کتنا عزیز تھا۔ والد مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''میں نے اپنا شعری مجموعہ ''زنجیر نغمہ'' ادھر شائع کیا ہے۔

اسے بھی کشمیر کی نذر کیا ہے۔ آپ کو بھیجوں گا۔"

پروفیسر محمد حسن ایک اعلیٰ پایہ کے محقق، نقاد اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ سیاسیات، سماجیات اور ادب کے مختلف گوشے ان کے خاص موضوعات تھے۔ وہ اپنی ذہانت قابلیت اور علم دوستی کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران انہوں نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کے لئے کئی منصوبے بروئے کار لائے۔ موصوف نے نہ صرف ریاست کے مشاہیر ادب پر تحقیقی کام کروانے میں سرگرم رول ادا کیا بلکہ وہ خود بھی مختلف سے میناروں اور علمی و ادبی تقاریب میں حصہ لیتے رہے اور اپنی شگفتہ زبان اور علمی قابلیت سے خاص و عام کو متاثر کرتے رہے ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کے کلچر، ادب اور ثقافت سے کتنا لگاؤ رکھتے تھے۔ 1989ء میں میرے والد مرحوم کی کتاب کشمیر کے مضامین، کے نام شائع ہوئی۔ یہ مجموعہ جیسا کہ ظاہر ہے کہ کشمیر کے کلچر تہذیب تمدن اور ادب کے گونا گوں پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب جب پروفیسر محمد حسن کی نظر سے گذری تو وہ 27 جون 1989ء کے خط میں اپنی زریں رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کشمیر کے مضامین ملے۔ آپ نے کشمیر کا حق ادا کر لیا۔
اردو والوں پر بہت زمانے سے یہ قرض چلا آیا تھا۔"

پروفیسر محمد حسن نے 1970ء میں دہلی سے سہ ماہی جریدہ "عصری ادب" کے نام سے جاری کیا۔ یہ رسالہ عصری آگہی کا ترجمان ہے اور اپنی گونا گوں خصوصیات کیلئے خاص و عام میں مقبول ہے۔ وہ سچے معنوں میں اُردو زبان و ادب کے پرستار تھے اور اس زبان کی ترقی و بقا کے لئے کام کرنا چاہتے تھے۔ عصری ادب سے اُنہیں گہری عقیدت تھی۔ اس جریدے کو اُنہوں نے اپنی محنت لگن اور اور صلاحیت سے بہت ہی قلیل مدت میں گونا گوں دلچسپیوں کا حامل بنا دیا اور یہ برصغیر ہندوپاک کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت ہی قلیل مدت میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر گیا۔ موصوف نے صرف نئے نئے موضوعات بروئے کار لاتے

تھے بلکہ خود بھی مختلف موضوعات پر مقالات لکھتے تھے۔حرفِ آغاز، سیاسی صورتحال، آڑے ترچھے آئینے اور کتابوں کی باتیں اُن کے مستقل کالم ہوا کرتے تھے۔ان کالموں کے ذریعے سے وہ برصغیر ہندوپاک کے تازہ ترین علمی وادبی رجحانات پر روشنی ڈالتے تھے۔عصری ادب وقت پر شائع کرنا اور اس کو سالانہ خریداروں اور شاعروں اور ادیبوں تک پہنچادینے کیلئے جو پہل وہ کرتے تھے۔اس کی داد نہ دینا کورذوقی ہوگی۔پڑھنے والوں کو بھی اس جریدے کا بے حد انتظار رہتا تھا۔ایک دفعہ جب میرے والد مرحوم نے ان سے رسالہ نہ ملنے کی اطلاع دی تو انہوں نے اپنے ایک خط میں یوں تحریر فرمایا:۔

> ''عصری ادب آپ کو ہر بار معمولی ڈاک سے بھیجا جاتا ہے۔براہ کرم مطلع کریں کہ آپ کو کب سے رسالہ نہیں ملا اور کون کون سے شمارے ملے ہیں۔''

اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اس جریدے کو زندہ رکھنے کے لئے کتنی محنت کرتے تھے۔سہ ماہی ''عصری ادب'' نے قلیل مدت میں اپنی پہچان منوالی۔نہ صرف علمی وادبی دُنیا میں یہ رسالہ مقبول ہوا بلکہ برصغیر ہندوپاک میں بھی اس نے اپنی چھاپ ڈال دی تھی۔پروفیسر محمد حسن کشمیر میں عصری ادب کے چاہنے والوں اور تاحیات رکنیت حاصل کرنے والوں کے لئے میرے والد مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''میرا بڑا لڑکا جاوید حسن سری نگر جارہا ہے۔آپ سے ملے گا۔براہ کرم عصری ادب کے لئے 30 روپیہ عام خریداروں سے اور 200 روپیہ حیاتی رکنیت والے حضرات سے وصول کرکے جاوید حسن کے ذریعہ بمعہ خریداروں کے پتوں کے بھیجوادیں۔ممنوں ہوں۔''

سعادت حسن منٹو۔حیات اور کارنامے پر سیر حاصل تحقیقی مقالہ سپردقلم کرنے کے بعد جب 1986ء میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوکر منظر عام پر لایا تو برصغیر ہندوپاک میں

ان کے اس کام کی خوب پذیرائی ہوئی اور وہ ماہر منٹویات کے نام سے علمی وادبی دُنیا میں جاننے اور پہچاننے لگے۔ پروفیسر محمد حسن نے جب یہ کتاب ملاحظہ فرمائی تو انہوں نے والد مرحوم کے اس کام کو دِل کھول کر داد دی۔ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

> ''بایں ہمہ برج پریمی کی یہ کتاب ابھی تک منٹو پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے اور اُردو کے افسانوی ادب کے ہر طالب علم کے لئے لائق مطالعہ''

والد مرحوم کے نام ان کے کئی اور خطوط اُن کی فائیل میں موجود ہیں۔ جن میں پروفیسر محمد حسن نے ان کے اس تحقیقی کام کو بے حد سراہا۔ان خطوط کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

- ''منٹو پر آپ کا کام ہرگز حقیر نہیں۔ یہ تکلف اور خاکساری ٹھیک نہیں۔آپ نے نہایت وقیع کام کیا ہے۔''
- برج پریمی نے بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں جو عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔ یہ باب واقعی اتنا جاندار ہے کہ عصری ادب کے صفحات پر دوبارہ شائع ہونے کا مستحق ہے۔''
- منٹو پر آپ کا تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں ملا۔شکریہ! آپ نے اس کی اشاعت پر مجھے یاد رکھا۔خوشی ہوئی۔''
- اس پر عصری ادب میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا ایک جلد اور بھجوادیں۔آپ نے واقعی جی لگا کر کام کیا ہے اور اہم کام کیا ہے۔''

پروفیسر محمد حسن کے اور بھی کئی خطوط میرے والد مرحوم کی فائل میں موجود ہیں۔ان خطوط سے بھی دونوں کے قریبی روابط کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خطوط اگرچہ کافی مختصر ہیں لیکن ان کی اہمیت کم نہیں۔ یہ خطوط پوسٹ کارڈ پر خوش خطہ لکھے گئے ہیں اور ان سے بے پناہ خلوص،شفقت اور محبت کے جذبات ٹپکتے ہیں۔ وہ کبھی والد مرحوم کو برج پریمی کبھی برج

لال ایمہ، اور کبھی برج کشن ایمہ کے ناموں سے مخاطب کرتے ہیں اور کام کی بات لکھتے ہیں۔آپ کو ان خطوط میں کہیں پر بھی بے کار گفتگو نظر نہیں آئے گی۔خطوط کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

- 'عصری ادب' کا تازہ شمارہ آپ کو پرسوں ڈاک سے بھیجا گیا ہے۔رسید سے نوازیں اور زر سالانہ، 30 روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجوا کر ممنون کریں۔

(11/ستمبر 1982ء)

- بھئی یہ بیماری والی بات ٹھیک نہیں۔اپنی صحت کی طرف توجہ کیجئے۔

(27/جون 1989ء)

- آپ کا خط ملا۔مجموعہ مضامین بھی موصول ہوا شکریہ۔ (7/دسمبر 1982ء)
- پچھلے شمارے میں منٹو پر آپ کی کتاب پر تبصرہ نظر سے گزرا ہوگا۔

پروفیسر محمد حسن اب اس دُنیا میں نہیں اور نہ میرے والد محترم۔لیکن پروفیسر محمد حسن کے یہ مکاتیب میرے پاس محفوظ ہیں۔گذشتہ دنوں ''مشاہیر ادب کے خطوط برج پریمی کے نام''، ترتیب دے رہا تھا اس میں پروفیسر حسن کے خطوط کا یہ نادر سرمایہ شامل ہے۔اس طرح سے نہ صرف یہ خطوط کتابی صورت میں محفوظ ہیں بلکہ ریسرچ اسکالروں کے لئے بھی یہ کتاب مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

●●●

مظہر امام کی شاعری

مظہر امام عصر حاضر کے ایک اہم اور نمائندہ شاعر ہیں۔ اُردو شاعری میں وہ اپنی ایک الگ شناخت قائم کر چکے ہیں، ان کی شاعری منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے طرزِ تحریر، اسلوب اور لب و لہجے سے بھی انفرادی رنگ و آہنگ جھلکتا ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی اپنے مضمون ''مظہر امام کی شاعری کا انفرادی رنگ و آہنگ'' میں مظہر امام کی شعری زبان کو ان کے فن کی کامیابی قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> ''مظہر امام کی زبان شعری ہے۔ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا جو تجربے کیے۔ ان کی ترسیل میں کامیاب رہے، اُن کے الفاظ تجربوں اور خیالوں سے ہم آہنگ ہیں اور ترنم ریزی اُن کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ یہ شاعری قاری کے تخیل کو مہمیز لگاتی ہے اور اس کے ذہن کو اسی سمت موڑتی ہے جہاں شاعر قاری کو لے جانا چاہتا ہے۔''(۱)

(۱) سہ ماہی ''نئے سلسلے (بدایوں) شمارہ نمبر ۸، جولائی ۱۹۸۵ تا جون ۱۹۸۶، ص ۶۷

پرخلوص جذبات کا شدت کے ساتھ اظہار، انوکھی تشبیہات واستعارات اور لطیف علامتوں کا برتاؤ مظہر امام کے فن کا حاصل ہے۔ ڈاکٹر حامد چھپروی مظہر امام کی شاعری کو روایت اور جدیدیت کا سنگم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اظہار و بیان کے اعتبار سے مظہر امام آج کے شعراء میں کامیاب ترین انسان ہیں۔ ان کی شاعری زبان و بیان کے اعتبار سے روایتوں اور جدّتوں کا سنگم ہے ان کی نظمیں اور غزلیں صاف وشفاف بلور ہیں، جن میں ان کے تجربات کی صہبا چھلکتی دیکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اظہار و بیان کی نئی راہوں کو اپنایا ہے۔ علامتوں اور استعارات میں بھی نیا پن اور تازہ کاری ہے۔'' (۱)

مظہر امام ایک منفرد انداز کے فن کار ہیں۔ ان کا فن ترقی پسند اور جدیدیت کی فضاؤں میں پھلا پھولا اور پروان چڑھا۔ اس لئے اس میں ان دونوں میلانات کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان کی ابتدائی دَور کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں لیکن بعد میں یہ اثرات آہستہ آہستہ زائل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی اُن کے فکر کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں بھی برق رفتاری کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اسی لئے اُن کی شاعری میں خوبصورت تشبیہات، استعارات اور علائم ملتی ہیں۔ جن میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور جدیدیت کے واضح نقوش بھی۔

مظہر امام کے کلام میں جہاں فکر کی گہرائی ملتی ہے وہاں ہیئتی اعتبار سے بھی اُن کا کلام پختہ ہے۔ اُن کے کلام کا بیشتر حصہ معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تشبیہ، استعارہ، علامت اور پیکر تراشی سے بھی کام لیا ہے۔ مظہر امام کی شاعری میں تشبیہات کی بڑی اہمیت ہے۔ تشبیہ کے ساتھ ساتھ استعارہ بھی ان کی شاعری میں انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔ استعارہ کی تعریف کرتے ہوئے علم البیان میں بتایا گیا ہے کہ

(۱) سہ ماہی ''لمحے لمحے'' بدایوں۔ شمارہ نمبر ۸۔ ۱۹۸۵ء جولائی تا جون ۱۹۸۶ء۔ ص ۵۲

اس کی حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق زیر نظر رکھا گیا ہو یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب کسی لفظ کے حقیقی معنی ترک کر کے مجازی معنی دیئے جائیں اور ان میں تشبیہ کا تعلق ہو تو یہ استعارہ ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے بڑے فنکاروں نے اپنے فن پاروں میں استعارے سے بھی خاص کام لیا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس کا استعمال شعر میں ہوا ہے بلکہ نثر میں بھی اس کا استعمال ہوتا رہا ہے۔

مظہر امام نے اپنے تخلیق شعر میں علامت، تشبیہ اور استعارہ کا بھرپور اور برمحل استعمال کیا ہے۔ اس بات میں دو رائیں نہیں کہ شاعری میں استعارے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کی بدولت ہی شاعری میں ایجاز پیدا ہوتا ہے۔ مظہر امام نے بھی اپنی شاعری میں مفاہیم پیدا کرنے کے لئے استعارے استعمال کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جن تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی اور لطافت سے سدا بہار ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں میر کا دھیما دھیما لہجہ پایا جاتا ہے۔ وہاں وہ اقبال کے فن سے بھی متاثر ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کے فن کے دھندے دھندے نقوش بھی جلوہ گر ہوتے ہیں اور خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی اور رفعت سرداش کے اثرات بھی ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ جدید نظم نگاروں میں وہ اختر الایمان، راشد اور فیض کے شاعرانہ لہجے سے بھی متاثر ہیں۔ اس طرح سے ان کی شاعری جدید اور قدیم روایات کا سنگم ہے۔ خود ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

> "میں نے میٹرک میں اور کالج کے پہلے سال میں میرؔ، دردؔ، مومنؔ، حالیؔ، اقبالؔ، اصغر گونڈویؔ، جگر کو پڑھا تھا۔ دوسرے سال میں جب میں ادب کے نئے رجحانات سے شناسا اور نئے ادب کے نمونوں سے آشنا ہوا تو جوش کو کھنگال ڈالا۔ پھر، فیضؔ، راشدؔ، یوسف ظفرؔ، اختر الایمان اور منیب الرحمٰن کی نظمیں اور فراقؔ کی غزلیں مطالعے کا محور بنیں۔ میری ابتدائی شاعری کے دوسرے دور

میں ان سب کے اثرات کہیں کہیں مل جائیں تو تعجب نہیں ہونا
چاہئے۔" (۱)

مظہر امام کا تجربہ عمیق، مشاہدہ وسیع اور اندازِ تحریر جداگانہ ہے۔ ان کی شاعری کی کامیابی کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو علامتوں کی وساطت سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مظہر امام کے کلام میں بیشتر مقامات پر علامتی اسلوب ملتا ہے اُنہوں نے بہت ساری بلیغ باتوں کو علامتوں کے ذریعے سے سمجھانے کی کوشش کی ہیں۔ ان کے علائم میں پیاس، سمندر، چراغ، سفینہ، سورج، روشنی، آنگن، برف، چنار، دھواں، مکان، سایہ، شمع، بلبل وغیرہ جیسے بہت سی علامتیں ملتی ہیں۔ یہ علائم مثبت بھی ہیں اور منفی بھی۔ کیونکہ ان کے تقابل سے ہی انہوں نے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر یہ علامتیں ان کی غزلوں میں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ جہاں تک جدید غزل میں علامتوں کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:۔

> "جدید غزل کی محبوب علامتیں سایۂ تنہائی، اندھیرا روح کا کھوکھلاپن سورج، پیڑ، پانی، ریت، کیچڑ، پتھر، جنگل وغیرہ ہیں۔ یہ وہ علامتیں ہیں جو واضح طور پر ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کے مفہوم بھی ہر شاعر کے یہاں بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن کم از کم انہیں کسی غزل یا نظم میں دیکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جدید غزل یا نظم ہوسکتی ہے۔ (۲)

اسی طرح سے مظہر امام کی یہ علامتیں جدید علامتوں کے ذیل میں آجاتی ہیں جو ان کی غزل کو نئے معنی و مفاہیم عطا کرتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) ماہنامہ "شاعر" بمبئی (گوشۂ مظہر امام) جلد ۵۲، شمارہ ۹۔ ۱۹۸۱ء۔ ص ۳۶
(۲) ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ 'نئی علامت نگاری'۔ انجمن تہذیب نو پبلی کیشنز ڈویژن الٰہ آباد ۱۹۷۵ء۔ ص ۱۲۳

یوں نہ مرجھا کہ مجھے خود پہ بھروسانہ رہے
پچھلے موسم میں ترے ساتھ کھلا ہوں میں بھی

اب کے آندھی بھی چلی جب تو سلیقے سے چلی
یوں کہ رہ جائے شجر، شاخ ثمر ورنہ رہے

کب دھنک سوگئی، کب ستارے بجھے
تمہارے ساتھ میں گہرائیوں میں اترا بھی

سمندروں سے گُہر کب کے ہوگئے ناپید
کوئی کب سوچتا ہے ترے شہر میں

چراغ جلتا نہیں اور دھواں نکلتا ہے
ترے مکان میں جو کچھ نہ ہو وہ تھوڑا ہے

بے تعلق تو نہ تھے اتنے سحر سے پہلے
چاند ڈوبا تو یہاں ہو نہ وہاں ہو یارو!

پیاس تیری بھی اگر بجھ جائے
پی کے میں سات سمندر آؤں!

وقت کا سورج سوانیزے پہ کب کا آچکا
آنکھ والوں نے قیامت کا سماں دیکھا نہیں

مظہر امام ایک ایسے فنکار ہیں جو اپنے خیالات اور تجربات مؤثر طریقے سے موزوں تراکیب استعمال کر کے پیش کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ شاعری میں تشبیہ، استعارے، علائم اور تراکیب کی اس قدر اہمیت ہے کہ ان کے توسط سے شاعر مؤثر انداز میں اپنے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرسکتا ہے۔ تراکیب کی موزوں بندش اور ان کا برجستہ استعمال شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ اپنے مافی الضمیر کو زیادہ سے زیادہ مؤثر الفاظ میں پیش کرنے کا نام ہے۔ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک کے شعری نمونوں کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ بڑی شاعری محض ہیئتی اعتبار سے شعر کو پیش کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ خیال کی نزاکتوں اور گہرائیوں کو پیش کرنے کا نام ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعر مروجہ الفاظ اور تشبیہات و استعارات پر اکتفا نہیں کرتا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بجا طور پر کہا ہے:۔

> "شاعر عام زبان کی توسیع کرتا۔ ہے اور ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیتا ہے............شاعر کو جب خیال کے اظہار کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ نہیں ملتے تو اسے کلمات و الفاظ کا سینہ چیر کر اس میں نئے معنی کی رُوح داخل کرنی پڑتی ہے۔" (۱)

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر کے خیال کی بلندی مروجہ الفاظ کی قبا میں سکڑ جاتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے اظہار کو مؤثر ڈھنگ میں پیش کرنے کے لئے تشبیہ، استعارے، تراکیب اور علایم وغیرہ کا سہارا تلاش کرتا ہے اور اپنے اصل مقصد کو انہی کے پیراہن میں پیش کرتا ہے تاکہ پڑھنے والے پر زیادہ اثر ہو۔ اور وہ شاعر کے اصل خیال کے قریب آجائے۔ تشبیہ، استعارے، علایم کے ساتھ ساتھ تراکیب کا عمل بھی شروع سے ہی اردو شاعری میں ملتا ہے، میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ، اقبال کی شاعری میں بہترین تراکیب کا استعمال ملتا ہے۔ جدید شعراء نے بھی بعض نئی اور بعض پرانی تراکیب نئے مضامین استعمال کر

(۱) پندرہ روزہ آواز (دہلی) (اقبال نمبر) جلد ۴۲، شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۷ء۔ ص ۴

کے اردو شاعری میں نئے رنگ بھر دیئے ہیں۔ اقبالؔ نے تراکیب کی جدت سے ہمارے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ ان کے برمحل اور برجستہ استعمال سے انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے بلکہ فنی لحاظ سے ہمارے ذوق کی آسودگی کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اگرچہ اپنے فن کو اپنے مقصد کا تابع بنایا ہے لیکن اپنے فنی منصب کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ چنانچہ وہ نت نئی تراکیب سے ایک پوری تصویر پیش کر دیتے ہیں۔

مظہر امام بھی شعر و شاعری کی دُنیا میں ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ داخل ہوئے انہوں نے نئے تراکیب کے استعمال سے اپنی شاعری میں نئے مفاہیم پیدا کئے۔ ان کی شاعری میں بعض ایسی تراکیب ملتی ہیں جو شعرائے قدیم کی تقلید نظر آتی ہیں لیکن ان تراکیب کی بندش سے انہوں نے اپنی شاعری میں نئی معنویت پیدا کی ہے۔ ان میں سے بعض تراکیب ایسی ہیں جو ان کے پسندیدہ شعرا مثلاً اقبالؔ، جگرؔ، جوشؔ، فیضؔ، اختر الایمان، راشدؔ وغیرہ کے ہاں ملتی ہیں۔ مظہر امام کے مختلف شعری مجموعوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے شعری پیکر تراشتے وقت جن تراکیب کا استعمال کیا ہے وہ اس طرح سے ہیں:۔

حیاتِ پریشاں، دشتِ محبت، فرازِ چرخ، زلفِ پریشاں، صورتِ جرس، چشمِ فسوں، تیغِ خون، جامِ سفال، حریفِ نور، سکوتِ گل، دامنِ حیات، دردِ عالم، دردِ محبت، طفلکِ شوق، نبضِ کونین، حدیثِ شوق، آخرِ شب، عروسِ صبح، کفِ حیات، جنونِ عشق، رنگِ ہجر، منزلِ حسن، راہِ صنم، گلستانِ ارم، حضرتِ شیخ، انجمن ناز۔ (زخم تمنا سے)

گنبدِ فردا، سنگِ صبح، روحِ تشنہ، لبِ سکوت، نقشِ پا، تاثیرِ دُعا، دستِ دُعا، سیلِ صبح، دستِ رعشہ دار، مانندِ خشت وسنگ، اہلِ ہوس، حشرِ تماشا، صاحبِ نگاہ، سرِ شاخِ ثمر، حسن تبسم، بامِ فلک بوس، شاخِ ثمر دار۔ (رشتہ گونگے سفر کا سے)

نقوشِ پا، گردرہ، فصلِ تمنا، دشتِ بلا، سکوتِ کوہ، محوِ دُعا، منزلِ دل، جزو بدن، گردشِ

ایّام، سرِشام، نگہ تمام، عضو بدن، ماہِ تمام، کارِ شوق، موجِ مے۔ (پچھلے موسم کا پھول سے)

اس ضمن میں اُن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ مظہر امام تراکیب استعمال کرنے کا کیسا انداز رکھتے ہیں:۔

شاخِ گل سے لپٹ کے روتی ہے
اس چمن کی ہَوا کو کیا کہیے!

نگاہِ دوست ذرا بے حجاب ہو تو کہاں
حدیثِ شوقِ وفا کامیاب ہو تو کہوں!

نظر ملائے بھلا کس طرح ضعیفیٔ شب
عروسِ صبحِ مسرّت کا آئینہ ہوں نہیں!

بددُعا کس لمحۂ حاضر کی ہے مجھ پر امام!
ہوں صدائے عصر لیکن گنبدِ فردا میں ہوں

ہاتھ سُوکھے ہوئے پتّوں کے بڑھیں
جب سرِ شاخِ ثمر ور آؤں

کچھ خرد مندوں کی نکتہ چینیوں کے باوجود
میری طرزِ فکر میں دیوانہ پن آیا تو ہے

کئی دِن سے نشیمن خاکِ دِل کا
سرِ شاخِ ہَوا ہے اور میں ہوں

روندی ہوئی زمین تھی، نئے رہ گزر بھی تھے
وہ تھے تو اپنے ساتھ نقوشِ سفر بھی تھے

جہاں تک حقیقی فنکار کا تعلق ہے وہ وقت کی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور اُس کے لہجے میں نئی اقدار کا رچاؤ بساؤ آتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں مظہر امام کی شاعری کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اُن کے یہاں نئی امیجری بھی ہے اور احساس شدت بھی جذبہ بھی اور عصری حسیت کی خوشبو بھی۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری میں دل کو پگھلا دینے والی کیفیت ملتی ہے۔ مثلاً:۔

جانا کوئی مشکل بھی نہیں دار سے آگے
یہ فاصلہ چند قدم بولا تو بہت ہے

تم نے تو منزلوں کے نشاں تک مٹا دیے
ہم لے کر جائیں اپنا شعور سفر کہاں

وسعتیں اپنی لیے، سمٹی ہوئی دُنیا میں ہوں
میں سمندر ہوں مگر خود پیاس کے صحرا میں ہوں

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
جیسے کچھ اور شوق کو آزاد ہی نہ تھا

سچ کے صحرا میں اُنہیں ڈھونڈ کے تھک ہار گئے
جھوٹ کے شہر میں یاروں کا بسیرا نکلا

کب دھنک سوگئی، کب ستارے بجھے
کوئی کب سوچتا ہے ترے شہر میں

سکوتِ کوہ ہے اور سایۂ در
صدائے ماسوا ہے اور میں ہوں!

بلند بام ہوا کا مکان کھلتا تھا
میں چھوسکا جو اسے سخت جان رکھتا تھا

تمہاری یاد میں پیتے ہیں لوگ آنسو بھی
ہمارے نام پہ جشن طرب ہی ہوتا ہے

چار شاخوں کو مینا سے ڈھلتا ہوا
درد بچے کی صورت مچلتا ہوا!

مظہر امام زبان پر اچھی گرفت رکھتے ہیں۔ وہ الفاظ کے تانے بانے سے اپنے خیالات میں تازگی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ طنزیہ لہجہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لب ولہجہ میں قوت، تاثرات میں گہرائی احساسات میں شگفتگی اور اندازِ بیان میں دل کشی ملتی ہے۔ مظہر امام اپنی غزلوں اور نظموں میں خوبصورت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری میں پانی، دھواں، پتھر، آندھی، ہوا، طوفان، روشنی، خواب، عکس، کنکر، سایۂ ابر، آئینہ، آگ، دھوپ ،ثمر، پانی وغیرہ جیسے الفاظ کی تکرار سے لفظوں کے معنی بدل گئے ہیں جس کی بدولت ان کی کئی کئی جہتیں سامنے آئی ہیں۔ اُن کی شاعری میں تجربے کی وحدت اور لفظ وبیان کے اختصار کی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً:۔

مجھ سے ہی پوچھ رہا ہے مری منزل کا پتہ
میرے رہبر کی ذرا راہبری تو دیکھو

شاید کہیں سورج کی کرن شام کو پھوٹے
ہم شمع جلائے ہوئے بیٹھے ہیں سحر سے

ایک ہی موسم ہے آنکھوں کا الم ہو یا نشاط
میں مگر مچھ کی طرح احساس کے دریا میں ہوں

ایک مدت سے مرے گھر میں کوئی آیا نہیں
ان شناساؤں میں کوئی آشنا چہرہ نہیں

سمندروں سے گہر کب کے ہوگئے ناپید
تمہارے ساتھ میں گہرائیوں میں اُترا بھی

وہ شخص ہے کہ نسیم سحر کا جھونکا ہے
بکھر ہی جاؤں جو اُس کو گلے لگاؤں میں
رات ٹھہرے ہوئے دریا میں بہت ہلچل تھی
میری تنہائی کے ساحل پہ کوئی اترا تھا

وہ تارِ خواب میں بیٹھے گلوں کے گھر میں رہے
مگر یہ غم ہی رہا خود کو شادماں کرتے

مظہر امام کے یہاں اُردو کے بعض نمائندہ شاعروں کی طرح الفاظ کا مناسب استعمال ملتا ہے۔ یہ الفاظ ان کے خیالات میں جہاں قوت اور تاثیر پیدا کرتے ہیں وہاں شگفتگی اور دل کشی کو بھی مہمیز عطا کرتے ہیں۔ وہ افکار و معنی کے رشتے سے آگاہ ہیں اور ان کو شعر

میں موتی کی طرح پروتے ہیں۔ وہ اپنے شعری پیکروں میں کہیں کہیں ثقیل فارسی الفاظ اور بوجھل تراکیب بھی کمال فنکاری اور چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ گراں نہیں گزرتیں۔ ان کے ہاں نرم ونازک ہندی آمیز الفاظ بھی ملتے ہیں جن کے استعمال سے ان کی شاعری میں شیرینی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً ان کی شاعری میں بھنور، آندھی، جھنکار، چتا، جھونکا، آکاش، بانکپن، دھرتی، رتجگواں، شجرہ، کشکول، پجاری، دیوتا، رستا وغیرہ جیسے الفاظ اس کثرت سے استعمال کئے ہیں کہ ان کے کلام میں ہندی اور اردو کا دلکش امتزاج پیدا ہوگیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروار کے مصداق چند اشعار پیش خدمت ہے۔ جن سے ان کی شاعری میں نرم وملائم ہندی الفاظ کی آمیزش کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:۔

عاشقوں سے وہ اینٹھ لاتے ہیں
اپنے ماں باپ کے دُلارے ہیں

ساتھ بہتے ہوئے دھارے کے نہیں بہہ سکتے
آپ کے رنگ میں ہم شعر نہیں کہہ سکتے

اپنی دیوارِ اَنا کا بھی سہارا نہ ہوئے
ہم پجاری کے پجاری رہے دیوتا نہ ہوئے

کوئی خوشبو کی جھنکار سنتا نہیں
کون سا گل کھلا ہے ترے شہر میں

صدیوں سے چتا میں جل رہا ہوں
لمحے لمحے گناہ کی سزا ہے

ایک آندھی مکانوں میں چلتی ہوئی
اک پرندہ فضا میں سنبھلتا ہوا !

مظہر امام بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل بھی وہ جس کی اپنی منفرد حیثیت ہے لیکن ان کی شعری کائنات میں نظم، آزاد غزل، رباعیات اور ترائیلے بھی موجود ہیں جن میں عام زندگی کے مسائل سے دلچسپی لی گئی ہے۔ مظہر امام کے انداز میں اعتماد اور اظہار میں زور ملتا ہے۔ ان کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے متنوع ہیں اور ان میں زندگی کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے پہلو کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک عام انسان کے درمیان رہ کر زندگی کے کرب کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ لہٰذا ان تجربوں کو بیان کرنے میں اُن کا مکمل خلوص کارفرما رہتا ہے لیکن اس سے قطع نظر فنی اعتبار سے ان موضوعات کی تخلیقی بازیافت انہیں ایک عام انسان کے قریب لاتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی :۔

> ''یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مظہر امام انسان کے بنیادی المیے سے واقف اور اس کو شعر میں ڈھالنے کی پوری قوت رکھتے ہیں''(۱)

مظہر امام کی منظومات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تجربہ عمیق اور مشاہدہ وسیع اور اندازِ تحریر جداگانہ ہے۔ ان کی نظموں کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ علامتی اسلوب رکھتے ہیں ۔ وہ غزلوں کی طرح اپنی نظموں میں بھی استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کی ابتدائی نظموں میں ترقی پسند ادبی تحریک کی چھاپ ہے۔ ایسی نظمیں ان کے اوّلین شعری مجموعے 'زخم تمنا' میں ملتی ہیں۔ ''رشتہ گونگے سفر کا'' کی نظموں میں جدت ملتی ہے۔ تنہائی، محرومی، مایوسی، خاموشی اور بے چہرگی عام طور پر مظہر امام کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات کو سلیقے سے برتنے اور ان میں جدت پیدا کرنے میں ان کے فنکارانہ چابکدستی کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی مظہر امام کی شاعرانہ

(۱) شمس الرحمٰن فاروقی...... فاروقی کے تبصرے۔ شب خون کتاب گھر الہ آباد۔ ۱۹۹۸ء

عظمت کے فکر کے ساتھ ساتھ فن کی افادیت پر زور دیتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

"کسی شاعر کی شاعرانہ عظمت اُس کی فنی ومعنوی بلندی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی بلند فکر اور ارفع واعلیٰ خیالات کو فنی چابکدستی سے شعر میں ڈھال لے تو اعلیٰ ادب کی تخلیق کرسکتا ہے۔ شعر کے فکر وفن جسم اور رُوح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رُوح کی جلوہ گری کے لئے جسم ضروری ہے اور جسم بغیر روح کے بے معنی بعینہٖ یہی فکر وفن کا رشتہ بھی ہے۔ فن کارانہ تراش خراش اور اعلیٰ فکر واحساسات کی آمیزش سے ادب کا لافانی شاہ کار تخلیق ہوتا ہے۔" (۱)

مظہر امام نے فنی سطح پر بھی تجربے کیے ہیں۔ وہ ردیف اور قافیے سے قطع نظر زبان وبیان میں بھی جدت سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے تشبیہات واستعارات میں جدت پیدا کرکے اپنی نظموں کو ایک نئے آہنگ میں ڈھالا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ پرانے الفاظ کا استعمال بھی نئے معنوں میں کرتے ہیں اس ضمن میں ان کی برف میں آگ، خواب سچ بھیہوتے ہیں، انتظار، آؤ، اشتراک، تشکیک، حیاتِ آوارہ، ترائیلے وغیرہ سبھی نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن میں مظہر امام نے اپنی فنکاری کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ چند نظموں کی اقتسابات پیش خدمت ہیں:۔

خیر اچھا ہوا، تم قبیلے بھی میرے قبیلے میں آہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں
چہرہ اُترا ہوا
ایک غم کے سوا
نیند اُچٹتی ہوئی

(۱) ڈاکٹر زرینہ ثانی 'سیماب کی نظمیہ شاعری' ... کتاب ... دہلی۔ ۱۹۷۸ء، ص ۹۵

بال بکھرے ہوئے
خیر اچھا ہوا، تم بھی میرے قبیلے میں آہی گئے۔
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں!

(اشتراک)

میری نگار دل آرا، گراں ہے سنگِ حیات
غمِ وفا سے بہت چور ہوگیا ہوں میں
فسونِ عشق سلامت مگر یہی ہے مآل؟
کہ تم سے ہو کے قریں، دُور ہوگیا ہوں میں
تمہاری چارہ گری کا کوئی قصور نہیں
جو قلبِ وقت کا ناسور ہوگیا ہوں میں

(نگارِ شہر)

جیسے کوئی شاعرِ ناکام تڑپے داد و تحسیں کے لئے
آرزوئیں جس طرح دل کی خلاؤں میں ہوں محوِ پیچ و تاب
دشت میں کرتا ہو کوئی تشنہ لب جس طرح پانی کی تلاش
ڈھونڈتا ہو سایہ جیسے گرمیوں کی دوپہر کا آفتاب
زندگی یوں ہی بھٹکتی پھر رہی ہے جستجوئے موت میں!

(حیاتِ آوارہ)

مظہر امام نے مختصر ترین نظموں کے قابلِ قدر تجربے بھی کیے ہیں۔ ان نظموں میں بھی نئے اور جدید طرزِ عمل کو اپنایا گیا ہے۔ الفاظ کا موزوں انتخاب ان کا برجستہ اور بلیغ استعمال مظہر امام کی مختصر نظموں کا خاصا ہے۔ ان نظموں میں بھی موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ علامتوں کا بلیغ استعمال جگہ جگہ ملتا ہے۔ ان علامتوں کے پس پشت معنی کا وسیع سمندر چھپا ہوا ہے لیکن یہ علامتیں اس قدر پیچیدہ اور مبہم نہیں ہیں بلکہ مظہر امام کی غزلیہ شاعری کی طرح ملائم اور سبک ہوتی ہیں۔ زخمِ تمنا کی نظموں میں حیاتِ آوارہ، چہرہ، آؤ، خیر طلب، سوال

اور رشتہ گونگے سفر کا، میں، اگر کھل گئی آنکھ، آئینے سے ٹپکتا لہو، کھلے آسمان کے نیچے، بچھڑے ہوئے لمحے سے پرے، وہ ایک بات، رات دن کا قصہ وغیرہ جیسی مختصر نظمیں بھی مظہر امام کی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ فراہم کرتی ہیں۔

پروفیسر مسعود حسین کو نہ صرف مظہر امام کی نظم 'آؤ' میں نظم وضبط اور وحدت تاثر نظر آتا ہے بلکہ وہ ان کی نظم، اشتراک، کو بھی ان کی فنکاری کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں مظہر امام نے ان نظموں کی تخلیق میں نہایت ہی محتاط فنکار کے طور پر اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ مثلاً:۔

بے ادب ستاروں نے
نیند میں مخل ہو کر
تم سے کچھ کہا ہوگا
لیکن ان کی باتوں کا
تم یقین مت کرنا
آؤ آ کے خود دیکھو
مضطرب کہاں ہوں میں؟ (آؤ)

ان کے دوسرے شعری مجموعے "رشتہ گونگے سفر کا" میں بھی بہت سی نظمیں ایسی ملتی ہیں جو بہت مختصر ہیں لیکن مظہر امام نے ان میں علامتوں کے ذریعے سے اپنی بات بلیغ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ "وہ ایک بات" میں اپنے خیال کا اظہار نہایت بلیغ انداز میں یوں کرتے ہیں:۔

میں نے اک بات محسوس کی
میں نے وہ بات تم سے کہی
تم نے اس سے کہی
اس نے ان سے کہی

پھر مجھے بھی نہ اس کی خبر ہو سکی
کس نے کیا بات
کس سے کہی! (وہ ایک بات)

ایک اور مختصر نظم ملاحظہ کیجئے:۔
بکھرا بکھرا
اُلجھا اُلجھا
ٹوٹا ٹوٹا
کھویا کھویا
ٹیلی ویژن پر اک چہرا
اپنا چہرہ مانگ رہا تھا (آئینے سے ٹپکتا لہو)

مظہر امام کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی ان کے بیان کا اختصار ہے۔ ان کی نظموں میں بھی دوسری اصناف کی طرح ایک الگ انداز ملتا ہے۔ اُن کے لب و لہجے میں رومانیت، لطافت اور شیرینی ملتی ہے۔ ان کی رُومانیت جہاں ایک طرف ماضی کی اچھی قدروں کی بازیافت ہے وہاں یہ حال کا بھی بھرپور ادراک رکھتی ہے۔ مظہر امام کا مطالعہ وسیع ہے، اسی لئے ان کے یہاں فن کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مظہر امام جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں اسی کو موزوں اور مناسب الفاظ کے ذریعے ایک عمدہ شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی نظمیں لب و لہجہ، مخصوص ڈکشن اور موضوع و ہیئت کے اعتبار سے ایک انفرادی خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان میں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ فضا آفرینی مقام و ماحول کا انوکھا پن، انتخاب اور بیان کا انفرادی رنگ خاص طور پر جھلکتا ہے۔

مظہر امام کی آزاد غزل اپنے اسلوب بیان کے اعتبار سے ایک علیحدہ آہنگ پیدا کرتی

ہے۔اس میں بھی ان کی غزل اور نظم کی طرح اُن کے فن کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ زبان،تشبیہات واستعارات اور تراکیب کی موزوں بندش مظہر امام کی آزادغزلوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ان کی علامتیں بھی اپنی سادگی کے باوجود ایک خاص تنوع رکھتی ہیں۔ان کی آزادغزلوں میں پیکر تراشی کا عمل بھی نمایاں ہے۔اُن کے ایک ایک لفظ سے نہ جانے کتنے پیکر وجود میں آتے ہیں۔جن سے فضا سازی کا ایک ایسا منظر نظروں کے سامنے آجاتا ہے جو قاری کے لئے دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ان کے یہاں علامات برتنے کے عمل میں روایت اور جدّت کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

صبح کا تڑکا ہوتے ہوئے اُڑ جاتے تھے لفظوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات

آ مرے جسم تک آ، ابر طرح دار کی طرح
یہ تو معلوم ہے تو جھانک نہ پائے گی مری روح کے اندر، نہ سہی

شاخ در شاخ گلابوں کی دھنک پھوٹی ہے
اک پرندہ تھا یہیں رہتا تھا

مظہر امام کی علامتیں روایتی پیکروں کو اپنے الفاظ کے ملبوسات سے متحرک بناتی ہیں مثلاً شاخ، آنسو، مسکان، دھواں، فلک، خاک، سمندر وغیرہ روایتی الفاظ ان کے یہاں ایک نئے انداز سے سامنے آتے ہیں۔ان علامتوں کے علاوہ انہوں نے اپنی آزادغزلوں میں جدید ترین علامتیں استعمال کی ہیں۔جن سے ایک نئی امیجری وجود میں آتی ہے۔ اوراس امیجری سے جدید فکری رجحانات کے علاوہ تجربے کی وسعت پیدا ہوتی ہے۔لمحہ، پانی، ریت، سفر، صبح، لہو، رات، پتھر، جگر وغیرہ جیسے الفاظ ان کی آزادغزلوں میں ایک نئی

تحریک کو جنم دیتے ہیں۔ پیکرتراشی کا یہ عمل ان کی آزاد غزلوں میں ایک نئی فضا قائم کرتا ہے اور انسان کو خوابوں سے نکال کر حقیقی دنیا تعمیر کرنے پر اُکساتا ہے۔ مظہر امام کی آزاد غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کی فنکارانہ مہارت کے غماز ہیں:۔

سانس لینا ہی اگر زیست کا معیار بنے
یہ بہت ہے کہ فلک سر پہ رہے در نہ سہی گھر نہ سہی

آرزوؤں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے اُفق پر جگمگاتا جو ستارہ آپ ہیں

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

مظہر امام کی شاعری کے ساتھ ساتھ جب بھی ان کے فنکارانہ شعور کا جائزہ لیا جائے گا تو ان کی آزاد غزل کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ مظہر امام کی شاعری کا مطالعہ بحیثیت مجموعی ان کے اعلیٰ وارفع اور پختہ فنی شعور کا بھی بھرپور احساس دلاتا ہے۔

●●●

محمد ایوب واقف

محمد ایوب واقف محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ایک نامور محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اُنہوں نے تبصرے بھی لکھے ہیں اور وہ خاکہ نگار کے طور پر بھی ادبی دنیا میں جانے اور پہنچانے جاتے ہیں۔ ادب کے ان تمام شعبوں پر وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے درجنوں مقالات، خاکے، انٹریو اور تبصرے ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ جو برصغیر ہندوپاک کے معتبر جرائد و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں جن کی علمی و ادبی حلقوں میں وقتاً فوقتاً پذیرائی ہوئی ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''جگن ناتھ آزاد: ایک مطالعہ'' مکاتیب نگم، ذکر رفتگاں، شعور وادراک، میں زندہ ہوں، سردار جعفری: شخصیت اور شاعری، تعبیر وتشریح، پارو: ایک منظوم افسانہ وغیرہ شامل ہیں۔ واقف کی علمی وادبی خدمات کے پیش نظر مختلف انجمنوں اور اردو اکادمیوں نے انہیں مختلف اعزازات سے نوازا۔ سہ ماہی ''انتساب'' (سرونج) نے واقف کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ جس میں برصغیر ہندوپاک کے معتبر ادیبوں اور دانشوروں نے واقف کی شخصیت اور ان کی ادبی

خدمات کا جائزہ لیا ہے اور اپنے اپنے نظریات پیش کیئے ہیں۔ اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ واقف علم وادب کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ فکروفن میں گہرائی وگیرائی کچھ تو قدرت سے عطا کی گئی دولت ہوتی ہے اور کچھ اپنی محنت لگن اور صلاحیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محمد ایوب واقف کو یہ دولت ورثے میں ملی ہے۔ وہ علم وادب کے ایک محنتی، ہوش منداور باصلاحیت فنکار ہیں۔ ان کے مقالات پُرمغز اور فکر انگیز ہوتے ہیں۔ جن میں اندرونی وحدت ہے۔ عبدالقوئ دسنوی، اردو زبان وادب کے اس دیوانے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

> ''آج اُردو زبان وادب سے محبت کرنے والے بیشتر قاری نہ صرف ایوب واقف صاحب کی علمی وادبی خدمات سے باخبر ہیں بلکہ وہ ان کی رواں دواں اور فکر انگیز تحریروں کی قدر کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایوب واقف کا شمار ان ادیبوں میں ہے جو اپنی زبان اردو سے محبت کرتے ہیں اور اس کی بقا کیلئے فکر مند نظر آتے ہیں۔ اس کے فنکاروں کے لئے اچھے جذبات رکھتے ہیں اور ان کے متعلق خوب غور وخوض کے بعد اپنے صحت مند خیالات کا نہایت بے باکی کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔''

محمد ایوب واقف عصر حاضر کے ایک نمائندہ قلم کار ہیں۔ انہوں نے اپنا ادبی سفر اس زمانے میں شروع کیا جب ادب میں جدیدیت کا میلان شباب پر تھا۔ ترقی پسند تحریک کا اثر اپنا مثبت رول ادا کرنے کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ نئے ناقدین فن میں شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، محمد حسن، وارث علوی، گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری وغیرہ نئی ادبی تھیوری کے ساتھ سامنے آئے تھے اور اپنے سائنٹفک طریقۂ نقد کو بروئے کار لاکر ادبی دنیا سے بے پناہ خراج حاصل کر چکے تھے۔ ان کے اثرات سے لکھنے والوں میں ایک سی تحریک پیدا ہو گئی تھی۔ محمد ایوب واقف اگر چہ اسی دور میں ابھرے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس نئے ادبی رجحان کا گرویدہ نہیں بنایا۔ اس لئے انہیں کسی تحریک ازم یا رجحان سے جوڑنا ان کے

فن کے ساتھ ناانصافی کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ایک حقیقی فنکار ہیں۔ انہوں نے بیچ کا راستہ اختیار کیا ہے۔ واقف نے کلاسیکی ادب کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے اور قدیم روایات کو بھی ملحوظ خاطر میں لایا ہے۔ ان کے ہاں ترقی پسند اثرات بھی پائے جاتے ہیں اور وہ جدید میلانات کا بھی گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ دراصل انسان دوست ادیب ہیں انسانیت ان کا دھرم ہے اور اس دھرم کی آبیاری وہ اپنے خونِ جگر سے کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ جہاں محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے دلچسپ پہلوؤں کو اپنے قلم کی جولاں گاہ بناتے ہیں وہاں وہ علامہ شبلی نعمانی، مرزا انیس و دبیر، سر سید احمد خان اور علامہ اقبال کے فن پر بھی بڑی معنی خیز بحث چھیڑتے ہیں۔ وہ خواجہ احمد عباس، جوش ملیح آبادی، خواجہ حسن نظامی اور پنڈت سدرشن کی فنکارانہ کاوشوں کو بھی سراہتے ہیں اور اختر الایمان، کرشن چندر، قتیل شفائی، سردار جعفری اور قرۃ العین حیدر پر بھی کھل کر بحث کرتے ہیں اور ان کے فن کی دِل کھول کر داد دیتے ہیں۔

واقف کی شخصیت اور تصانیف پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ان کے بعض علمی وادبی پہلو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ جن کی اہمیت اور افادیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ اردو کا ایک نایاب مرثیہ، اندراوت اور اس کا مصنف، ماہنامہ زمانہ کا ایک مستقل عنوان، اُردو اور ہندی کا مسئلہ (مفاہمت کی راہیں) ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط جیسے واقف کے مقالات غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی، محمد ایوب واقف کی علمی وادبی قدر وقامت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''محمد ایوب واقف گوشہ نشینی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گوشہ نشینی نے انہیں لکھنے اور پڑھنے کا وافر موقع فراہم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے لکھنے اور پڑھنے کا بے پناہ کام کیا ہے مگر اس گوشہ نشینی کے باوجود ان کی علمی وادبی بلند قامتی نے اربابِ ذوق کو متوجہ کیا ہے۔''

مشاہیرادب سے ملاقات شروع سے ہی واقف کا اہم مشغلہ رہا ہے۔انہوں نے بے شمار ادبی شخصیات سے استفسار کر کے ایسے نتائج اخذ کئے ہیں جن کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ یہ ملاقاتیں علمی وادبی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ان مشاہیرادب میں راجندر سنگھ بیدی، ندافاضلی، علی جوادزیدی، خواجہ احمد عباس، باقر مہدی، قتیل شفائی، عصمت چغتائی، ڈاکٹر خلیق انجم، راہی معصوم رضا، جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی، انتظار حسین، فہمیدہ ریاض، عزیز قیسی، ملک زادہ منظور احمد، حسن نعیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی طرح سے انہوں نے مراٹھی زبان وادب کا بھی بخوبی جائزہ لیا ہے۔اور اس زبان کی ترقی وبقا کیلئے بھی کام کیا۔ واقف نے اردوداں طبقہ کو مراٹھی زبان کے بہت ہی اہم شخصیات سے متعارف کرایا اور اس طرح سے مراٹھی اور اردو زبان کے درمیان ایک اہم پل کا رول ادا کیا ہے۔ جو قابل ستائش ہے۔ان شخصیات میں ودھیادھر گھو کھلے، دلیش پانڈے، سیٹھ تاوراو پاگڑی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔واقف ہر ایک زبان کی قدر کرتے ہیں۔وہ زبانوں کو خانوں میں بانٹنے کے قائل نہیں۔وہ ہندوستانی کو اس لئے اہمیت دیتے ہیں کہ اس زبان نے حقیقی معنوں میں قومی یکجہتی، اخوت اور بھائی چارے کا درس دیا ہے۔ وہ زبان سے متعلق گاندھی جی کی فارمولا کی دل کی عمیق گہرائی سے داد دیتے ہیں اور ہر ایک زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔اردو کے ایک معروف ادیب ڈاکٹر محمد اقبال اپنے ایک مضمون میں واقف کی زبان سے متعلق نظریات کی داد دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

> ''واقف ان محبان اُردو میں سے ہیں جو اُردو کا رسم الخط اور اس کی روایتی شان وشوکت ولسانی انفرادیت کو کسی بھی طرح مجروح نہیں ہونے دینا چاہتے۔گاندھی جی نے ملک کے مخصوص حالات کے پیش نظر ہندوستانی کے فروغ پر جوزور دیا تھا، واقف بھی اس کی ستائش کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے بقول واقف ہندوستانی کے عنوان کے تحت ایک ایسی زبان کی داغ بیل ڈالنا

چاہی تھی جو عام فہم ہو اور دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے۔''

''اُردو کا ایک نایاب مرثیہ'' واقف کا ایک اور علمی وادبی کارنامہ ہے جو اُن کی تصنیف شعور ادراک میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالے پر غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں اس گمشدہ مسودے کے مصنف کی بازیافت کے بارے میں کس قدر عرق ریزی سے کام لینا پڑا۔ واقف نے سچے معنوں میں محقق کا فرض نبھا کر اپنی ان تھک محنت لگن اور بے پناہ صلاحیت سے کام لیا ہے اور اس نایاب مثنوی کے شاعر کی تلاش میں انہیں کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے دلائل وقرائن سے اس مثنوی کے شاعر کی بازیافت کی ہے اور اپنے استادِ محترم سید نجیب اشرف ندوی صاحب کے خواب کو حقیقت میں بدل دیا ہے۔ اس کام کو سرانجام دینے سے پہلے ندوی صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے لہٰذا اُنہوں نے واقف کے اس کارنامے کو اپنی کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ واقف کو اس بات کا شدید افسوس ہے کہ ان کی محنت کی داد دینے والے ان کے رہنما ندوی صاحب اس دُنیا میں نہیں۔

اندراوت اور اس کا مصنف واقف کے تحقیقی پڑاؤ کا ایک اور مرحلہ ہے۔ یہ مقالہ بھی اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے اور واقف کی محنت لگن اور تحقیقی کاوشوں کا پتہ دیتا ہے۔ واقف سچے معنوں میں ادب کے ایک آوارہ گرد سپاہی ہیں۔ وہ ادبی سیاحت کرنا ہی اپنی زندگی کا اعلیٰ اور ارفع مقصد تصور کرتے ہیں۔ اُن کی نظر تیز، دل کشادہ اور ذہانت بلا کی ہے۔ قدیم مخطوطات اور مسودات کا جائزہ لینا، ان پر گھنٹوں غور وفکر کرنا اور پھر ترتیب دے کر قارئین کے سامنے پیش کرنے کو ہی واقف حقیقی معنوں میں ایک سچے محقق کا جوہر تصور کرتے ہیں۔ خود ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

''اندراوت کا قلمی نسخہ مجھے ملا تو میری مسرتوں اور شادمانیوں کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس لئے کہ اس کی اہمیت کا ماجرا میں وقت کے سربرآوردہ اور مقتدر محققین کی زبانی سن چکا تھا۔

مگر ابھی تک باوجود تلاش بسیار کے کسی محقق کے ہاتھ یہ قلمی نسخہ لگا نہیں تھا۔ چونکہ اندراوت کا یہ نسخہ بہت پرانا اور کرم خوردہ تھا۔ اس لئے اس کے منصف کے نام کا پتہ نہیں چل رہا تھا اور نہ ہی اس کا علم ہو رہا تھا کہ اس کتاب کا نام کیا ہے۔ کتاب کا سرورق غائب تھا۔ اس لئے اور بھی دقتوں کا سامنا تھا۔ بہرحال صبر سکون اور پوری دلجمعی کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کیا تب یہ راز کھل گیا کہ کتاب کا نام اندراوت ہے اور اس کے مصنف مشہور و معروف صوفی شاعر نور شاہ کامیاب جونپوری ہیں۔''

اُردو اور نئی نسل اور اردو اکیسویں صدی میں واقف کے دو پر مغز مقالات ہیں۔ ان مقالوں میں وہ پڑھنے والوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اُردو زبان نے کس طرح سے ہر مشکل مرحلے میں اپنا ایک مثبت رول ادا کیا ہے اور انسان کو خواب غفلت سے بیدار کیا ہے۔ واقف اگر چہ ہر ایک زبان سے محبت کرتے ہیں لیکن اردو زبان سے انہیں عشق ہے کیونکہ اس میں گنگا جمنی تہذیب ہے۔ یہ نہ صرف قوم پرستوں اور وطن دوستوں کی زبان ہے بلکہ اس کی جڑیں مضبوط اور اس کے پروانے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے مطابق یہ میل جول اور باہمی اختلاط کی زبان ہے۔ اس میں رواداری بھی ہے اور وطن اور قوم پرستی کا جذبہ بھی، محبت اخوت اور بھائی چارہ بھی اور تحریک آزاد کے ان گنت سپنے بھی، جن کو بعد میں اس زبان نے حقیقت میں بدل دیا ہے۔ واقف اپنے اس مقالہ میں یہ بات صاف طور پر واضح کرتے ہیں کہ اردو روحوں میں اتر جانے والی زبان ہے۔ لہٰذا اس کی قدر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایک جگہ اپنے کلیے کی یوں وضاحت کرتے ہیں:۔

''اُردو زبان کے بارے میں یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ یہ ہمیشہ میل جول اور باہمی اختلاط کی زبان رہی ہے، محبت، رواداری اور بردباری اس کی سرشت میں شامل ہے۔ اعلیٰ

درجے کی قومیت اور وطنیت کا اس نے سراغ بھی لگایا ہے اور
ہندوستان کے عوام وخواص کو اس راستے پر انگلی پکڑا کر چلایا بھی
ہے۔تحریک آزادی کے آغاز سے لے کر حصول آزادی کے طول
طویل عرصے میں اس زبان نے جو قابل تعظیم اور قابل احترام
رول ادا کیا ہے۔

محمد ایوب واقف اُردو زبان وادب کے بے لوث خدمت گذار ہیں۔وہ اُردو ادب کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ادبی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، ادب کے نئے پرانے رجحانات پر معنی خیز بحث چھیڑنا،مختلف علمی وادبی موضوعات کو بروئے کار لانا اور نئے اور فکر انگیز ادبی نتائج صفحہ قرطاس پر لانا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ان کی تحریروں میں وزن پایا جاتا ہے۔ان کی تحریریں سیتا محل سے اندس کوٹ تک (ایک رپورتاژ) ہو یا ایشیا کی بیٹی۔قرۃ العین حیدر، اختر الایمان سے دو ادبی ملاقاتیں ہوں یا اُردو شعر وادب کا سردار، ختم ہونے کو نہ آئے گا غزل کا موسم ہو یا اس کے نقوش زندگی ثبت کریں گے تا ابد (ایک رپورتاژ) وہ ایک مصور کی طرح تصاویر کھینچتے جاتے ہیں۔واقف واقعات کو سلسلہ وار درج کرنے کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔وہ ہر ایک فن پارے کو اس کے تواریخی شواہد سے پرکھنے کے قایل ہیں۔ان کی تحقیقی صلاحیت کا بھر پور پتہ اُن کی تحریریں فراہم کرتی ہیں اس ضمن میں ان کی درج ذیل اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔جن میں واقف کا نپا تلا اسلوب اوران کے گوناگوں تجربات سامنے آتے ہیں۔مثلاً:۔

"جب میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتا یا پاتا ہوں کہ ترقی پسند
تحریک کے زیر اثر لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں نے اردو
زبان اوراس کے ادبی سرمائے کو اپنی تحریروں سے وقیع اور گراں
بہا کیا ہے تو مجھے کسی طرح کی الجھن یا کوئی اعتراض نہیں ہوتا بلکہ
میں صدق دل سے اس بات کا اعتراف کرلیتا ہوں لیکن جب

کوئی اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ اگر ادب کی ترقی پسند تحریک وجود میں نہ آتی تو اس صورت میں اردو ادب جمود اور تعطل کا شکار ہوتا تو میں ایسے شخص کو کوتاہ عقل سمجھتا ہوں اور یہ کہنے میں اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیتا ہوں کہ وہ تاریخی حقائق سے بالکل لاعلم ہے اس لئے کہ وہ ایک غلط اور بے بنیاد مفروضے پر ایمان رکھتا ہے۔"

(ایشا کی عظیم بیٹی، قرۃ العین حیدر)

تفریح اور سیر سپاٹے کی غرض سے ہم جعفری صاحب کے مکان سے جو بومن جی پٹیٹ روڈ پر ایک خوش نما عمارت سیتا محل میں واقع ہے باہر نکلے تو اس وقت میرے اور جگن ناتھ آزاد صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا آدمی ہمارے درمیان نہیں تھا چونکہ ہم ابھی ابھی سردار جعفری صاحب کے گھر سے نکلے تھے اس لئے ہمارے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی۔ اس کا براہ راست تعلق سردار جعفری صاحب کی شخصیت اور ان کے فن سے تھا۔ آزاد صاحب سردار جعفری کی شاعری اور شخصیت دونوں سے بے حد مرعوب تھے۔ میں نے ان کی اس مرغوبیت کو "حرف ناحق" جیسی کوئی شئے نہیں سمجھا بلکہ اسے ایک جائز اور قابل قبول فعل قرار دیا۔ اس لئے کہ میں خود بھی جعفری صاحب کی شخصیت اور شاعری کا شروع سے ہی قائل رہا ہوں۔"

(ستیا محل سے انڈس کورٹ تک۔ ایک رپورتاژ)

"پنڈت بدری ناتھ سدرشن کی شخصیت اور فن پر ابھی تک نہ تو اردو میں کوئی باقاعدہ کام ہوا ہے اور نہ ہی ہندی میں۔ جہاں تک میری معلومات اور مطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس خاکسار کے علاوہ ابھی تک کسی اہل قلم نے ان کی مستند سوانح حیات بھی مرتب نہیں کی ہے۔ میرے مقالے بہت پہلے جب "ہماری زبان" اور "آجکل" میں شائع ہوئے تو ان کے کافی چرچے رہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسالوں نے

انہیں ڈائجسٹ کیا۔ سدرشن کی اہلیہ محترمہ لیلاوتی دیوی نے انہی
دِنوں میں ایک خط لکھ کر میرا شکریہ ادا کیا اور بڑے فخریہ انداز میں
کہا کہ ''آپ نے پنڈت جی کے حالاتِ زندگی کو اتنی خوبصورتی
کے ساتھ قلمبند کر کے اُردو والوں کی طرف سے پنڈت جی کا
خاطرخواہ حق ادا کر دیا ہے۔'' (بدری ناتھ سدرشن۔حیات اور فن)

محمد ایوب واقف زبان و بیان کے معاملے میں بڑے محتاط ہیں۔وہ سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ان کے ہاں گنجلگ الفاظ نہیں ملتے سلسلہ وار واقعات قلم بند کرنے میں وہ مہارت رکھتے ہیں۔واقف صاف اور نرم لہجے میں بات کرنے کے قائل ہیں۔حقیقت بیانی واقف کے فن کا ایک اور وصف ہے۔اُنہوں نے اپنی تحریروں میں جوانداز اپنایا ہے، وہ اُنہیں عصر حاضر کے معتبر ادیبوں کی صف میں شامل کرنے کیلئے کافی ہے۔اُنہوں نے مستقل موضوعات پر جو کام کیا ہے، وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔عصر حاضر کے ایک معتبر اور معروف شاعر کیفی اعظمی کا کہنا بجا ہے کہ وہ خلوص اور محبت کا پیکر ہیں۔اُردو کے سرگرم اور فعال خادم کی حیثیت سے تو اُن کی شہرت دور دور تک ہے۔کام کی لگن تو اُن کے اندر اتنی ہے کہ جب کسی کام کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں تو جب تک وہ کام ختم نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے۔واقف کا تمام ادبی سرمایہ کتابی صورت میں نہیں آیا ہے۔ان کے تمام مقالات اور خاکے منظر عام پر آجائیں گے تو علمی و ادبی دُنیا میں ان کا مقام متعین ہو جائے گا۔

●●●

مرزا محمد یٰسین بیگ کی شاعری

ـــــ شاخ صنوبر کے تلے سے لہو لکیر تک

مرزا محمد یٰسین بیگ نئی اُردو شاعری کے کارواں میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، اگرچہ اُنہوں نے ابتدائی دور میں افسانے بھی لکھے لیکن اُن کا اصلی میدان شاعری ہے اور شاعری سے ہی اُن کے اصل جوہر اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ یٰسین نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اُس زمانے میں ریاستی اُردو شاعری کے اُفق پر بعض ایسے نام جگمگا رہے تھے۔ جن کی لو آج تک ہمارے شعر و ادب کے گلستان کو جگمگا رہی ہے۔ ان شعراء میں مختلف مکتبۂ فکر کے شاعر شامل تھے۔ جنہوں نے اپنی محنت لگن اور خداداد صلاحیت سے نہ صرف اُردو شاعری میں بلند مقام حاصل کیا بلکہ سرزمین کشمیر کا نام بھی روشن کیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہاں کلاسیکی شاعری کی صحت مند روایت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ نئے طرزِ فکر و احساس کا بہترین سرمایہ موجود تھا۔ یٰسین کے سامنے یہ دونوں روایات موجود تھیں۔ قدرتی امر ہے کہ وہ ان روایات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کو وسیع کر دیا۔

مرزا محمد یٰسین بیگ جنوری 1943ء میں جموں میں پیدا ہوئے، مقامی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد جموں وکشمیر کلچرل اکادمی میں ملازم ہوگئے۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہی یٰسین کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کلچرل اکادمی میں ملازمت نے اس شوق کو اور بھی فروغ دیا۔ اس دور میں انہوں نے سنجیدگی سے اُردو کے بڑے بڑے شعراء کا مطالعہ کیا۔ جن میں غالب، اقبال، جوش، فیض، جگر وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان شعراء کے علاوہ اُنہوں نے اختر الایمان، وزیر آغا، بلراج کومل، خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد علوی، عادل منصوری، بشیر بدر اور شہریار کی شاعری سے بھی فیض اٹھایا۔

پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب کشمیر میں اردو حصہ سوم میں محمد یٰسین کی ابتدائی زندگی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:۔

> ''مرزا محمد یٰسین بیگ پچھلے چند سالوں میں منظر عام پر آئے۔ بی اے کامیاب کر کے کشمیر میں کلچرل اکادمی کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اکادمی کے کتب خانے کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ اسی لئے کتب خانہ کے انتظام کی تربیت بھی حاصل کی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے اور افسانے بھی لکھتے ہیں لیکن شعر وسخن میں انہوں نے ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔''

سروری (مرحوم) کی یہ کتاب 1984ء میں جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ لہٰذا محمد یٰسین کی شخصیت اور فن پر لکھا گیا خاکہ مکمل نہیں ہے اور ان کے اوّلین شعری مجموعے ''شاخ صنوبر کے تلے'' کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے بعد محمد یٰسین ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ابھی چند برس پہلے سبکدوش ہوئے۔ اس دوران وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے دو اور شعری مجموعے ''دہر آشوب'' اور ''لہو لکیر'' کے نام سے شائع ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کی کئی منزلیں طے کر کے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

مرزا محمد یٰسین کا نام اگرچہ عرش صہبائی، حکیم منظور اور عابد مناوری جیسے شعراء کے ساتھ ہی لیا جاسکتا ہے لیکن حق بات تو یہ ہے کہ وہ ان شعراء کے بعد آنے والے شعراء کے کارواں سے تعلق رکھتے ہیں۔

یٰسین بیگ نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت لکھا لیکن جو کچھ بھی لکھا اس میں فنی معیار اور سنجیدگی قائم ہے۔

مرزا محمد یٰسین بیگ کا اوّلین شعری مجموعہ ''شاخ صنوبر کے تلے'' 1968ء میں شائع ہوا۔ اس میں نظمیں، غزلیں، نعت، قطعہ، سب کچھ شامل ہیں۔ اس طرح سے پتہ چلتا ہے کہ یٰسین ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ لیکن غزل اُن کی پسندیدہ صنف تھی۔ حالانکہ انہوں نے کافی تعداد میں نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن ان کی غزل میں بے پناہ درد ملتا ہے۔ یہ درد کبھی کبھی سنگین رُخ اختیار کرتا ہے اور وہ دِل کھول کر اپنے اندر کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ یہ چیز اُنہیں عصر حاضر کے معتبر غزلگو شعرائیں جگہ دینے کے لئے کافی ہے۔

ممتاز نقاد اور شاعر مظہر امام اپنی کتاب میں محمد یٰسین کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> ''محمد یٰسین بیگ کی شاعری میں جذبہ واحساس کی آنچ تیز ہے۔ وہ عموماً سبک اور مترنم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام شاخ صنوبر کے تلے ان کے متوازن اسلوب کا آئینہ دار ہے۔''(۱)

شاخ صنوبر کے تلے، کی خاص وعام میں اتنی مقبولیت ہوگئی کہ اس کا دوسرا ایڈیشن مناسب ترمیم واضافہ کے ساتھ بہت جلد شائع کرنا پڑا۔ اس مجموعے میں اُن کی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۵ء تک کی شاعری ملتی ہے۔ مجموعے کے حرف اوّل میں شاعر خود رقمطراز ہیں:۔

> ''شاخ صنوبر کے تلے کا موجودہ پیکر اس کی پہلی اشاعت ۱۹۶۷ء سے کافی مختلف ہے کچھ تخلیقات جو پہلی اشاعت میں تھیں

(۱) مظہر امام: تنقید نما ص ۴۳

اب شامل نہیں رکھی گئی ہیں۔ جبکہ کم وبیش اسی دور کی مزید تخلیقات
کا اضافہ کردیا گیا۔ اس طرح موجودہ مجموعہ ۱۹۶۰ء سے لیکر
۱۹۷۵ء تک کی تخلیقات کا احاطہ کرتا ہے۔" (۱)

"شاخ صنوبر کے تلے" میں ایک نعت، ۴۸ غزلیں، ۲۵ نظمیں، ۶ قطعات اور متفرق اشعار پر مشتمل ایک خوبصورت شعری مجموعہ ہے۔ اس شعری مجموعہ کا آغاز علامہ اقبال کے کلام سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک حمدیہ نظم پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس میں یٰسین خدا کے حضور میں سربسجود ہوتے ہیں۔ وہ اس جہاں کے خالق کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں۔ دیکھئے انہوں نے اپنی بات پڑھنے والوں تک کیسے پہنچادی ہے۔

جلوہ بے مثال دیکھ لیا — میں نے تیرا جمال دیکھ لیا
دونوں عالم پہ رحمتیں تیری — تیرا حسن کمال دیکھ لیا
عظمتیں تیری مملکت تیری — تیرا جاہ وجلال دیکھ لیا
عمر گزری سیاہ کاری میں — حاصل ماہ وسال دیکھ لیا
ہر طرف اختلاف کی باتیں — تیری امت کا حال دیکھ لیا
اپنے سارے قصور جان لئے — دل کے شیشے میں بال دیکھ لیا

اس کے بعد غزلوں اور نظموں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کہ یٰسین کی غزل نئے دور کی غزل ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں روایتی غزل کی رعنائی ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قدیم اساتذہ کا بھرپور مطالعہ رکھتے ہیں اور دور حاضر کے شعرا کے اثرات بھی قبول کر چکے ہیں۔ اُن کی ابتدائی دور کی غزل میں ترقی پسند دور کی چھاپ صاف طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور اپنی روداد خوبصورت اور بلیغ انداز میں بیان کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً

(۲) عابد مناوری: شاخ صنوبر کے تلے، ص ا

مرے قاتلوں کو خبر کرو کہ جو نیم جاں تھا وہ مرگیا
تھا وہ زخم خوردۂ آرزوغم آرزو سے گزرگیا

مانا کہ خفا ہوتم ہم سے پر ہم بھی تو واقف ہیں تم سے
ہونٹوں کی ہنسی نے کہہ ڈالے ماتھے کی شکن کے افسانے

مرے شعور سے خاموشیوں نے مانگا ہے
ایک ایسا نغمہ جو ہر روح میں اُتر جائے

قفس میں ہم نے جلائے ہیں اپنے خوں سے چراغ
کہ صبح آئے گی اک روز آشیاں کے ادھر

جسم ہیں قیدی بام ودر کے ذہنوں کی تو بات ہی کیا
اس پر بھی بے انت کی خدا کی کھوج میں انسان نکلا ہے

ہم خار بداماں بیٹھے ہیں احساس کے اس دوراہے پر
ہم جیسے خالہ پرستوں سے جو الجھے گا کیا پائے گا

''شاخ صنوبر کے تلے'' میں بعض گیت نماغزلیں بھی ملتی ہیں۔جن میں خیالات کی پختگی اور زبان کی سلاست بدرجہ اتم موجود ہے۔یسین نے بعض غزلوں میں ایسی علائم اورتراکیب سے کام لیا ہے جن سے کشمیر کی خوبصورتی کی تصویر، یہاں کے موسم یہاں کی تہذیب وتمدن کی بھرپور جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔مثلاً

زرد پتے سمٹتی لڑکی
کن خیالوں میں کھو گئی لڑکی

چپکے چپکے ذرا سلگتی ہوئی
چھوئی موئی سی کانگڑی لڑکی

موسموں کے اداس جنگل میں
گزرے لمحوں کو ڈھونڈتی لڑکی

زون خط میں کبھی نہیں لکھتی
یوں تو ہے ایک چاندسی لڑکی

ایک اور گیت نماغزل پیش خدمت ہے:۔

سب فجر بے لباس لگتے ہیں
عقیدے قیاس لگتے ہیں

جب بھی موسم بدلنے لگتے ہیں جانے کیوں ہم اُداس لگتے ہیں
کیا ہوا شہر میں کہ لوگ تمام اس طرح بدحواس لگتے ہیں

''شاخ صنوبر کے تلے'' میں شامل نظمیں بھی توجہ طلب ہیں۔ یہ نظمیں آزاد بھی ہیں اور پابند بھی۔ یہ نظمیں مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں اور انہیں غزلیہ شاعری سے دور لے کر عصر حاضر کے ایک باصلاحیت نظم نگار کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔یٰسین کبھی طلوع شام خزان سے سرشار ہوتے ہیں اور کبھی سایوں کا تعاقب نہ کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔کبھی مرگ مستقبل کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی یادوں کا گداگر بن کے ابھرتے ہیں۔کبھی انقلاب کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں اور کبھی نیل کے ساحلوں میں گم ہوجاتے ہیں۔کبھی نئ نسل کی داستاں رقم کرنے لگتے ہیں اور کبھی کل اور آج کے بارے میں غور وفکر کرنے لگتے ہیں۔یٰسین شاعر مشرق علامہ اقبال کو بھی یاد کرتے ہیں اور وہ ساحرلدھیانوی کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔مجموعی طور پر یٰسین کی ان نظموں میں خیالات کی پختگی، فن کی چابکدستی اور احساس کی تازگی ملتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ان کی ابتدائی دور کی نظمیں ہیں۔لہٰذا ان نظموں میں بھی ترقی پسند دور کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان میں عصری آگہی کا عرفان بھی ملتا ہے۔مثلاً چند نظموں کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے:۔

شفق پہ ملگجے سائے نکھرنے والے ہیں/خزاں رسیدہ چناروں کے دیار مغرب میں/ فلک کے عارض گلگوں پہ چند لمحوں بعد/سیاہ رات کے گیسو بکھرنے والے ہیں/ زمانہ مہر بہ لب ہے سکوت طاری ہے/ یہ ایک لمحہ میری زندگی پہ بھاری ہے!!(طلوع شام خزاں)

تم نے ناگ نہیں پالے ہیں
تم کیا جانو
دھرتی کے سینے میں نہاں ہیں
ہیرے موتی

سونے، چاندی کے بے انت خزانے

جن پر

رنگ برنگے ناگ حکومت کرتے ہیں! (نظم اپنے بچوں سے)

محمد یٰسین بیگ اپنی نظموں میں اپنے خیالات وجذبات زیادہ عمدگی اور خوبصورتی سے پیش کرنے کے روادار ہیں۔ ان کی بعض نظمیں اپنے نت نئے تجربات کی وجہ سے نئ نظم نگاری کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں ایک عجیب قسم کی کسک ملتی ہے۔ نظم نقطۂ آغاز کے بعد مرکزی خیال سے گذر کر اختتامیہ تک پہنچ جاتی ہے اور ان کی ہر ایک نظم مربوط کہانی بن کر سامنے آجاتی ہے اور قاری کو اپنی طرف جھنجھوڑ دیتی ہے۔

''دہر آشوب'' اور ''لہو لکیر'' محمد یاسین کے دو نئے شعری مجموعے ہیں۔ جن سے عمدہ شاعری کے نمونے فراہم ہوتے ہیں۔

''دہر آشوب'' جنوری ۱۹۹۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں ان کی کوئی غزل شامل نہیں بلکہ یہ محمد یٰسین کی نظموں پر مشتمل ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ یہ نظمیں مختصر بھی ہیں اور طویل بھی جو گوناگوں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس بات میں دو رائیں نہیں کہ مرزا محمد یٰسین بیگ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ محمد یوسف ٹینگ ان کا اوّلین شعری مجموعہ ''شاخِ صنوبر کے تلے'' میں یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''اُن کی خوش نوائی اور رسیلی آواز کا منجمد تسلسل لگتا تھا۔ ایک ایسا دریچہ جو کسی لوک دُھن کی تکرار کرنے والے بربط کا منظر دکھاتا اور سناتا تھا جیسے وہ ایک نابالغ کی طرح الفاظ کی شیرینی پر چٹخارے لے رہا ہو لیکن جب میں نے اس تاثر کی عینک سے زیرِ نظر مجموعے پر نظر ڈالی تو میں تقریباً لڑکھڑا گیا کیونکہ حسیت اور اسلوب کا انقلاب اس قدر دنگ کرنے والا تھا کہ اپنے حواس کی کھوئی تھامے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا دشوار تھا''

اس اقتباس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ محمد یٰسین اپنی دلنواز غزلوں کے لئے معروف تھے۔ ان کی گیت نما غزلیں اپنے اچھوتے اور کنوارے اسلوب کی وجہ سے زبان زدِ عام ہیں اور اُن کی نظمیں بھی معنی خیز آسان اور عام فہم اسلوب لئے ہوئے ہیں۔ ''دہر آشوب'' کا آغاز ''حمد'' سے ہوتا ہے۔ یہ اُن تمام دعائیہ نظموں سے مختلف ہیں۔ جو عام طورر پر شعراء حضرات اپنے شعری مجموعوں کے آغاز میں تحریر کرتے ہیں۔ محمد یٰسین کی نظم حمد اس طرح اختتام پذیر ہوتی ہے۔

معبدوں کی فصیلوں تلے سرنگوں

ہر جبیں......!

اس ایک مختصر سے بند میں تہہ داری بھی ہے اور گہری معنویت بھی۔ قاری خود سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ شاعر اس نظم میں کیا کہنا چاہتا ہے۔

''دہر آشوب میں'' قلمی چہرا، تارکول کی جھیل، بے چہرگی کا سفر ہفت پیکر، خود فریبی، پری محل، نروان، عذاب نامہ، زون، بازگشت وغیرہ محمد یٰسین کی وہ نظمیں ہیں جن میں انسان کے ذاتی تجربات بھی ملتے ہیں اور عصری آگہی کا عرفان بھی، انسان کی محرومی اور لاچاری بھی اور ذات کا کرب بھی اور یہ تمام نظمیں شاعر کے گوناگوں تجربات کی غماز ہیں۔ مثلاً نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:۔

اب مرے ہاتھ نہیں اُٹھ سکتے

زرد ہونٹوں پہ دُعا ہے نہ خدا

نہ تمنائے ضیا

ذہن کی سطح پہ بھی جم گیا ہے

تارکول (تارکول کی جھیل)

زرد فائل پہ بے حس لکیروں کی

الفاظ لکھتے رہو
بے صدا ٹیلی ویژن پہ رقصاں
لکیروں کو پہچان لینا
کوئی فن نہیں (سبز پیڑوں کی صلیب)

میں دیوانہ نہیں ہوں
بجا کہ میری آنکھیں بھی
شفق کی سرخیوں کی نرم تعبیریں لئے ہیں
بجا کہ میرا دامن بھی
لہو کی شاخ جیسا ہے
بجا کہ سایہ سایہ زندگی کی روشنی
مجھ کو نگلتی ہے (نروان)

کشمیر کم و بیش اُردو کے اکثر شعراء کا موضوع رہا ہے۔ بعض شعراء نے اس موضوع کو برتنے میں اپنی بھرپور صلاحیت کا استعمال کیا اور اس جنتِ بے نظیر کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے لیکن بعض شعراء ایسے بھی ہیں جو کشمیر کی تاریخ وجغرافیہ سے بے خبر ہیں اور جنہیں کشمیر کی فضاؤں سے لطف اندوز ہونے کا کوئی موقعہ نہیں ملا ہے لیکن انہوں نے بھی کشمیر کے بارے میں سنی سنائی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ یٰسین کشمیر کے حقیقی فرزند ہیں۔ ان کی نس نس میں کشمیر کا کلچر، تہذیب اور تمدن رَواں دَواں ہے۔ وہ کشمیر کی صحیح تصویر کشی کرنے میں کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ ژون، پری محل، روئی کے گالے اور دریچہ زندگی اُن کی بعض ایسی نظمیں ہیں جن سے کشمیر کے موسموں، پھولوں، پھلوں، دَھان کے کھیتوں اور یہاں کے کلچر کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہیں۔ پری محل اور ژون جیسی نظموں میں یہ خوب اُبھر کے سامنے آتی ہے۔ ان دونوں نظموں میں کشمیر

کی تاریخ کا ایک خوبصورت باب روشن ہوتا ہے۔

خود فریبی، سپینے ٹوریم، سمندروں کا سفر، کلاس روم میں، ایسی نظمیں ہیں جو اپنے معنی آفرینی اور اختصار کی وجہ سے قابل توجہ ہیں۔

''لہو لکیر' مرزا محمد یٰسین بیگ کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ جو اپریل ۱۹۹۶ء میں گوجری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جموں کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس کا انتساب انہوں نے آڑی ترچھی لہو لکیروں کے نام کیا ہے۔ جو سفید برف کو نت نئے عنوان دیتی رہتی ہیں، لہو لکیر کو شاعر نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ نظمیں : اس میں ۱۹ر نظمیں شامل ہیں۔

۲۔ غزلیں : یہ غزلیں لہو لکیر کے ۵۷ تا ۱۱۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

۳۔ نثری نظمیں : اس میں ۱۷ر نثری نظمیں شامل کی گئی ہیں۔

اس طرح سے لہو لکیر ۱۴۰ صفحات پر مشتمل مرزا صاحب کا ایک خوبصورت شعری مجموعہ ہے۔ مجموعے کے آغاز میں ایک بے عنوان نظم نظر نواز ہوتی ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

فصیلِ شب پہ چاند
ایک بدنما سا داغ ہے
وہ لوگ کیا ہوئے
جنہوں نے داغ داغ روشنی کی
چاندنی سمجھ لیا!!

یٰسین کا شعری مجموعہ ''لہو لکیر'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست جموں و کشمیر پرُ آشوب دور سے گزر رہی تھی۔ ہزاروں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا، بے شمار تعلیمی ادارے جلا دیئے گئے، مختلف کاروباری ادارے بم دھماکوں سے اُڑا دیئے گئے۔ بہت سارے بچے تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آنے لگی۔ جموں اور لداخ عمومی طور پر لیکن کشمیر خصوصی طور پر اس قہر کا شکار ہوا۔ ہر ایک شاعر اور

ادیب، مصور اور اخبار نویس، اس طوفانی سمندر کے بھنور میں آ گیا۔ ایک عجیب طرح کا خوف پیدا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کشمیر کی بنیادیں ہل اُٹھیں۔ محمد یٰسین بھی ان تمام چیزوں سے لرزہ براندام ہوئے۔ وہ بھی اپنے دِل کا درد بیان کرنے لگے۔ لہو لکیر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ درد صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

بس اک تقدس زنداں
کہ نیم بسمل ہیں
کچھ انتظار دریچوں میں
جھانکتے چہرے
صدائے حلقۂ زنجیر
اور کچھ بھی نہیں (لہو لکیر)

ہمارے چار اطراف
موت کا رقص ہو رہا ہے
ہماری گلیوں کے پیچ و خم میں
کسی نے
بارود بھر دیا ہے (موسم مرگ)

خوف
معصوم اک پودا تھا
لہو سے سینچا
دہشت افروز فضائیں اسے بہلاتی رہیں (خوفیدہ)

لہو لکیر کی غزلوں میں نہ تو "شاخ صنوبر کے تلے" کا رنگ ملتا ہے اور نہ "دہر

آشوب'' کا بلکہ ان غزلوں کا اپنا ایک خاص رنگ ہے جو یٰسین کا خود ساختہ رنگ ہے۔ یہ رنگ انہوں نے کسی سے مستعار نہیں لیا ہے بلکہ اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے انہوں نے پیدا کیا ہے اور پھر ان کے مشاہدے اور مطالعے نے ان کی غزلوں میں انفرادیت پیدا کی ہے۔ ایک جگہ اس کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

نئی زمین ، نیا کوئی آسمان ڈھونڈوں
جو مجھ پہ آگ نہ اُگلے وہ کہکشاں ڈھونڈوں
کسی کی راہبری میرے کام نہ آئے
جو منزلوں پہ نہ ٹھہرے وہ کارواں ڈھونڈوں

مرزا محمد یٰسین کے موضوعات میں بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں عشق و محبت کے موضوعات بھی ملتے ہیں اور حیات و کائنات کے موضوعات بھی، وہ عصر حاضر کے ماحول کو بھی الفاظ میں پرونے کی کوشش کرتے ہیں اور انسان کے درد و کرب کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ لہو لکیر کی غزلوں میں یہ تمام موضوعات ملتے ہیں جن کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:۔

شہر بے سنگ میں رہنے کا اثر لگتا ہے
مجھ کو ہر شخص یہاں آئینہ گر سکتا ہے
نشاط باغ، پرندے، چنار کی خوشبو
اتر کے آئی ہے اب کوہسار کی خوشبو

لہو لکیر میں ایک طویل نظم بھی ملتی ہے۔ یہ دراصل بقول شاعر ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ایک طویل نثری نظم ہے۔ یہ نظم ذیل کے عنوانات کے تحت تقسیم کی گئی ہے۔

پہلا لفظ، جمورا، میرا ہمزاد، آنکھ مچولی، میرا سفر، گم کردۂ منزل، احتساب، بازگشت، تلخیاں، خوشبو کی تحریر کا ماتم کیا ہو، یادوں کا جشن، احساس عافیت، زون کے نام، تھکن اور واہمہ وغیرہ صرف چند عنوانات ہیں جو بظاہر مختلف نظمیں ہیں لیکن ان میں ایک ایسا موضوع

چھیڑا گیا ہے جوان تمام بکھرے ہوئے حصوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

لہو لکیر کی شاعری کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ شعری مجموعہ، شاخ صنوبر کے تلے اور دہر آشوب کی شاعری سے مختلف ہے۔ یہ شاعری زیادہ منجھی ہوئی ہے اور عصر حاضر کی اردو شاعری میں اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

مختصر یہ کہ مرزا محمد یٰسین بیگ ایک منفرد انداز کے شاعر ہیں۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ ان کی شاعری محض ان کی آواز اور ترنم کی وجہ سے مقبول ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ محمد یٰسین بیگ ریاست جموں وکشمیر کے ایک باصلاحیت شاعر ہیں۔ ان کا تمام شعری سرمایہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ ان کے کلام کو مکمل مدون وترتیب دینے کی ضرورت ہے، اس کے بعد ہی ان کا اردو ادب میں صحیح مقام کا تعین ہو سکتا ہے۔

●●●

عثمان جوہری کی شعری کائنات

صوفیوں کی بھی ایک الگ اور انفرادی دُنیا ہوتی ہے۔ خداوندی کی باتیں کرنا، خانقاہوں اور عبادت گاہوں میں زندگی بسر کرنا، انسان کی بھلائی کے لئے کام کرنا اور دُنیا کی ہر خوشی چھوڑ کر خدمت خلق میں جٹ جانا، صوفیوں کا مسلک ہے۔ یہ لوگ خدا کے پیارے بندے ہوتے ہیں۔ اور کائنات کی بھلائی میں اپنے آپ کو جذب کرنا اور عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن پاک، حدیث، تصوف، فقہ اور دینی علوم میں مہارت حاصل کر کے اپنی محنت لگن اور صلاحیت سے اپنے پروگرام کو بروئے کار لا کر کارزارِ حیات میں نیا رنگ بھرتے ہیں۔ مزاج میں فقر، قناعت، عشق اور سوز و گداز ان کی سرشت میں ہوتی ہے۔ اُردو شعر و ادب میں ایسے بے شمار نام لئے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی شاعری میں تصوف کے ان گنت رنگ بکھیر کر خداوندی کا پیغام عام کر دیا ہے۔ ولی دکنی سے لے کر دور حاضر تک بہت سارے شعراء ایسے ہیں جنہوں نے صوفی ازم کو اپنے خون جگر کی آمیزش سے ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ عثمان جوہری عصر حاضر کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اردو

غزل کو صوفیانہ استعاروں اور کنایوں میں ڈھال کر اس کو نئی سمت و رفتار عطا کی اور تصوف کے میدان میں نئے گل بوٹے کھلائے۔ مجازی غزل کہنے والوں میں عثمان جوہری پیش پیش ہیں جو تصوف سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنی آواز سے قارئین کے دلوں کو سرشار کرتے ہیں۔ معروف شاعر نعیم ابن علیم، عثمان جوہری کو خالص صوفی شاعر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے مجموعۂ کلام ''تُو بہ تُو'' کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:۔

''تصوف کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اور عشق حقیقی کے رنگ میں رنگی ہوئی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام عثمان جوہری ہے۔ عثمان جوہری جن کا سلسلہ طریقیت مجدویہ قادریہ ہے، خوش گفتار ہی نہیں خوش کردار بھی ہیں .... فقیری اور سادگی کی زندگی کو خود کے لئے نعمت بیش بہا تصور کرتے ہیں۔ تصوف کی وادیوں میں جب اُنکی صدا صدائے بازگشت کی طرح گونجتی ہے تو سننے والوں کے دلوں میں اللہ ہو اللہ ہو کے ورد کی خواہش جگادیتی ہے۔''

عثمان جوہری کے تین شعری مجموعے تو بہ تو (۲۰۰۷ء) روبرو (۲۰۰۹ء) اور گُو بہ گُو (۲۰۰۹ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تینوں نام اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ ہیں اور تصوف کی مختلف منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے کلام سے بھی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ صوفی ازم سے انہیں کتنی عقیدت ہے۔ دیکھئے وہ اپنے کلیے کو کس طرح سے شعر کی زبان عطا کرتے ہیں:۔

اے طائرِ باعزم فلک پر نہ قناعت
جاری رہے پرواز تری جانب طوبی
میرے دِل میں فقط اب تری آرزو
کیونکہ نظروں میں ہے ہرطرف تُو ہی تُو

یہ تیری شانِ غفاری مکاں سے لامکاں تک ہے
درخشاں ہیں کرم کتنے ہی تیرے اسم اعظم میں

تصوف کی مختلف منزلوں کو سر کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے ایک تو بے پایاں محنت لگن اور صلاحیت کا جذبہ کارفرما ہے اور دوسری طرف عشق، خلوص، ہمت و استقلال، اولوالعزمی اور دلپذیر طرزِ بیان کا ہونا لازمی ہے۔ عثمان جوہری یہ دونوں چیزیں ورثے میں حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے والد نہایت ہی دیندار، شریف النفس اور مذہب پرست تھے۔ ان کے مزاج میں فقر، بے پروائی، متانت، دردمندی اور جذبۂ ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عثمان کو ان سے دینی علوم، فقیرانہ طبع، اور خاکساری کے گوہر ملے۔ والدین کی تعلیمات سے انہوں نے راہ اور روشنی پائی اور پھر محنت لگن اپنی فنی صلاحیت سے وہ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ رب کو یاد کرتے رہے اور اپنے جوش اور ولولے سے ان منازل کو طے کرتے گئے۔ جہاں پہنچنے کے لئے بڑے بڑوں کے قدم رُک جاتے ہیں لیکن عثمان جوہری اپنے علائم لہجے اور نرم گفتار سے سفر کرتے رہے اور اپنی محنت اور کوشش پیہم سے شعر و ادب میں بلند مقام حاصل کیا۔ ان کے صوفیانہ اشعار میں گہرے معنی چھپے ہوئے ہیں۔

عثمان جوہری اس دور کے ایک معروف صوفی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا جائزہ لینے سے یہ بات بخوبی اخذ کی جاسکتی ہے کہ وہ غالب کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے فکر و فن سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں حالانکہ اس بات کی طرف نہ انہوں نے خود اشارہ کیا ہے اور نہ ان کے کسی تبصرہ نگار نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے ہاں عشق، خدا، زندگی، مومن، خودی، خودنگری، خرد، مکاں، لامکاں، شاہین، عندلیب، طائرِ قفس، بلبل وغیرہ جیسے اقبال کی عزیز ترین علائم اور موضوعات ملتے ہیں۔ جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عثمان علامہ اقبال سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ عشق، علامہ اقبال کی طرح عثمان کی شاعری کا اوّلین پڑاؤ ہے۔ جس نے نہ صرف انہیں نیا مزاج عطا کیا بلکہ عشق کو سلیقے سے برتنے کی

طاقت بھی عطا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق ایسی شئے ہے جس سے انسان اپنی عظمت کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔ اس لئے ان کے ہاں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کی کارفرمائی ملتی ہے۔ عشق میں وہ بے خود بھی ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی سنبھل جاتے ہیں۔ وہ بخوبی عشق کی عظمت کا احساس رکھتے ہیں اسی لئے وہ اپنی زندگی کی رہ گذر عشق میں ہی تلاش کرنے لگتے ہیں۔

اس بات کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں:۔

عشق کی منزل ہے اپنی زندگی کی رہ گذر
درد وغم مہماں نہ ہوتو عظمتِ انساں کہاں

عثمان جوہری نے عشق، زندگی، حیات، کائنات، انسانیت، حسن اور حیات جیسے ان گنت تصورات کو بھی اپنی شاعری کا محور بنایا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تصوف ان کے ہاں مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ بات بھی کسی شک وشبہ کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ وہ کائنات کے ذرے ذرے سے پیار کرتے ہیں اور اپنے اشعار سے اس کی رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ ان موضوعات کو علامہ اقبال نے بھی الفاظ کا جامہ پہنا کر اُردو شاعری کو تازگی اور توانائی بخشی ہے۔ عثمان سچے اور کھرے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں اقبال کے تصورات کا عکس صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً عثمان کے ان اشعار سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ انہیں علامہ اقبال سے کتنی گہری عقیدت ہے:۔

اک اضطراب ضروری ہے زندگی کے لئے
شعور وفکر یہ آخر قیام کیا کرنا
لگی ہے آتش فرقت دل وقفس میں بھی!
اے حسن تیری نگاہوں کا کوئی پیمانہ
ہوجاتا ہے یقین بھی وہم وگماں کے ساتھ
رازِ درون عشق ہے اس انکشاف میں

مانا یہ زندگی تو ہے ساری گناہ سے بھری
عثمان خطا کا تزکیہ ہے نفس کی طناب سے
یہ سوز و آہ وفغانِ عشق کے قرینے ہیں
سلگتا رہتا جو دل آتشیں نشاں ہوتا
وجود نغمۂ لاہوت میں جو ہوتا گم
مقام پھر تو اے عثمان لامکاں ہوتا
زیست کی امید تو ہے آشنائے زیست سے
تقوئ لاہوت سے پُر مرشدِ کامل کہاں!
خودی میں ڈوب جا اور چاک کر اپنے گریباں کو
ستم ڈھانے دے خود پر چرخ ہائے فتنہ ساماں کو
کب عرشِ بریں تک ہے تصور کی رسائی
افکار بھی جبرئیل سے شہکار ہوئے ہیں
یہی نصیب ہے تیرا اے عندلیبِ قفس
تو پر بھی تول تو صبر وقرار پیدا کر
ہے یہاں بے کار بلبل اب تری آہ وفغاں
ایک پنجرا ہے یہاں صیاد ہے اور کچھ نہیں

عثمان جوہری نے نہ صرف علامہ اقبال کے علائم سے کام لیا ہے بلکہ اُنہوں نے اقبال کی تراکیب سے بھی اپنی شاعری میں رنگ آمیزی کی ہے۔

علامہ اقبال حرکت وعمل کے شاعر ہیں اور اسی حرکت کو انسان کی سب سے بڑی طاقت قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک زندگی مسلسل حرکت کا دوسرا نام ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ چونکہ نظامِ کائنات حرکت کے اصول پر تعمیر ہے۔ لہٰذا انسان اس حرکت کے قانون سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اقبال نے خودی کا انحصار ندرتِ فکر وعمل

پر قرار دیا ہے۔ عثمان جوہری بھی اقبال کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیکھئے وہ کیسے اپنے انفرادی انداز سے اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی ان کے علامہ اقبال سے گہری عقیدت کا احساس ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں:۔

یہ تیری شان غفاری مکاں سے لامکاں تک ہے!
درخشاں ہیں کرم کتنے ہی تیرے اسم اعظم میں
یہ کس کے عشق نے تحریر میرے دل پہ لکھی ہے؟
خودی کا سوز شرمندہ ہوا ہے پڑھ کے محفل میں
نگاہِ مرد مومن میں گلِ ایماں مہکتا ہے
سراپا کفر کا ہوتا ہے پنہاں رنگِ حاہل ہیں
خرد نے ڈال رکھی ہیں کمندیں زر پرستی کی
شہادت کے لئے اہل جنوں تیار ہو جاؤ
ذوقِ سجود، رمزِ خودی، عشق اور جنوں
جلوے سمیٹ لیجئے اپنی صفات کے
پھر زیرِ قفس ہوکر کیوں نغمہ سرا بلبل!
صیاد سے ممکن ہے کب اس کی نگہبانی
تدبیر عملِ پیہم ، تقدیر زبوں عالم
مومن کو لبھاتی ہے وہ فطرت زندانی
زیست کی اُمید تو ہے آشنائے زیست سے
تقویٰ لاہوت سے پرُ مرشدِ کامل کہاں

ان تمام مثالوں سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے عثمان جوہری پر گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ یہ اثرات نہ صرف فکری سطح پر نظر آتے ہیں بلکہ فنی سطح پر بھی نمایاں ہیں۔ اگرچہ عثمان جوہری ایک صوفی شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری میں قوس وقزح

کی طرح بے شمار رنگ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں مخصوص لہجہ اور ڈکشن ملتا ہے۔ جو انہیں ان کے معاصرین سے الگ اور انفرادی مقام عطا کرتا ہے۔ عثمان کی غزلیں شبنم سے دھلے ہوئے پھول کی مانند اپنی تازگی بکھیرتی ہوئی قاری کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ ان میں نہ صرف فکر و خیال کی بلند پروازی ہے بلکہ نغمگی اور سوچ بھی ہے۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوصف اگر یہ کہا جائے کہ ان کے ہاں اقبال رنگ شاعری ملتی ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔

●●●

جموں وکشمیر میں اُردو ناول کا سفر

ناول ایک مغربی نثری صنف ہے۔اس صنف نے دیکھتے ہی دیکھتے اُردو میں داخل ہوکر بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔اُردوادب کی دیگر مقبول اصناف میں یہ صنف ایک ممتاز اور نمایاں نثری صنف تصور کی جاتی ہے۔اگرچہ اس کی عمر ابھی سوسوا سو سال سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس نثری صنف سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔مغرب میں ناول لکھنے کا رواج بہت پہلے سے تھا۔اسی لئے انگریزی ناول زیادہ ترقی یافتہ شکل میں ہمارے سامنے ہے۔مہ نور زمانی اپنے ایک مضمون میں مغرب میں ناول کی ابتداء کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"ناول کی ابتداء سب سے پہلے مغربی ادب میں ہوئی۔۱۵۳۰ء کے بعد نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی بیداری کے زیر اثر انسان دوست ادیبوں نے ایسے قصے لکھنے شروع کیے جن میں روایتی داستانوں کے برعکس آسمان کے بجائے زمین کے معاملات اور زندگی کے مسائل کو

موضوع بنایا گیا۔ نئے ڈھنگ سے لکھے گئے یہ قصے پچھلے قصوں سے بالکل مختلف اور نرالے تھے، اسی لئے اُنہیں لفظ ’ناول‘ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ جس کے معنیٰ ’انوکھا‘ یا ’نرالا‘ ہیں۔‘‘ (۱)

ناول کے وارد اُردو ہونے سے قبل اُردو زبان میں متعدد کہانیاں اور قصے موجود تھے جن کی اہمیت مسلم ہے۔ انہی قصوں کے سہارے لوگ اپنا من بہلایا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قصوں اور کہانیوں کے لئے ہمارا ملک شروع سے ہی مشہور ہے۔ اسی لئے اس ملک کو قصوں اور کہانیوں کا دیش بھی کہا جاتا ہے۔ پنچ تنتر، ہتو اُپدیش، کتھا سرت ساگر صرف چند قصے ہیں جن کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ ان قصوں کے ساتھ ساتھ اگر اُردو داستانوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو طلسم ہوش ربا، بوستانِ خیال، الف لیلیٰ اور فسانۂ عجائب جیسی داستانیں ہماری نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ ان داستانوں میں فوق الفطری عناصر کا زبردست دخل رہا ہے۔ زمانۂ قدیم میں ان ہی داستانوں سے لوگ محظوظ ہوا کرتے تھے لیکن جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ترقی کی رفتار تیز ہونے کے ساتھ ساتھ تفریحی کے نئے نئے ذرائع پیدا ہونے لگے۔ انسان نے نہ ختم ہونے والے داستانی سلسلے کو خیر باد کہہ کر ناول کا مطالعہ کرنے سے اپنا رشتہ جوڑ دیا۔

ناول انگریزی لفظ ہے جو اب اُردو میں مستقل صنف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اردو کے نامور نقاد علی عباس حسینی اپنی کتاب ناول کی تاریخ اور تنقید میں انسائیکلوپیڈیا آف برٹینکا کے حوالے سے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

’’پہلے پہل یہ لفظ لاطینی زبان میں مختلف ہستیوں سے نئے کے معنی میں استعمال ہوا۔ پھر بوکیشیو نے اپنی کتاب ڈی کیمرن کے مقدمے میں اسے نئے قصوں کہانیوں اور تمثیلوں کے معنی دیئے۔ انگریزوں نے اسے سیرتی و کرداری قصوں کیلئے مخصوص کیا

(۱) اُردو اصناف: (نظم ونثر) کی تدریس مرتبہ افکار کول، مسعود معراج، ص ۱۷۱

اور ہم نے اپنی اردو میں اسے بھرتی کر کے اپنا لیا۔(۱)

بہر حال اگر ناول کو قصہ یا کہانی 'پلاٹ' کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کا مرقع کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ انگریزی ادب میں رچرڈسن اور فیلڈنگ ناول کے موجد تصور کئے جاتے ہیں۔ جبکہ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد نے سب سے پہلے ناول کی طرف متوجہ کیا اور اپنے ناولوں سے اس صنف کا سر آغاز کیا۔ انہوں نے کئی ناول لکھے جن میں بنات النعش توبتہ النصوح، رویائے صادقہ، ابن الوقت اور مراۃ العروس، وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان تمام ناولوں میں اصلاحی رنگ پایا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ساتھ جو ناول نگار ابھرے اُن میں شرر، مرزا رسوا، راشد الخیری، پریم چند وغیرہ جیسے ناول نگاروں کے نام لئے جاسکتے ہیں جنہوں نے اس فن کی آبیاری کی اور بڑے سبق آموز ناول لکھ کر اس صنف کو فروغ دیا۔

ریاست جموں وکشمیر میں ناول نگاری کی ابتداء کے سلسلے میں ہمارے سامنے دو نام آجاتے ہیں۔ پنڈت سالگرام کول سالک اور محمد الدین فوق۔ یہ دونوں قلمکار متنوع دلچسپیوں کے مالک تھے۔ ادب صحافت، سیاست اور کشمیریات سے اُنہیں خاص لگاؤ تھا۔ دونوں قلمکاروں نے علم وادب کے گوناگوں موضوعات پر کتابیں لکھیں اور چوٹی کے ادیبوں اور صحافیوں میں نام پیدا کیا۔ دونوں نے ریاست میں اردو اخبار جاری کرنے کی کوشش کی لیکن حکومت وقت کی طرف سے اجازت نہ ملنے پر ان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ سالگرام سالک (۱۸۵۷۔۱۹۲۹ء) اپنے زمانے کے معروف شاعر، ادیب، صحافی اور قانون دان پنڈت ہر گوپال کول خستہ (۱۸۴۸۔۱۹۲۳ء) کے چھوٹے بھائی تھے۔ لہٰذا ادب اور صحافت سے اُن کی دلچسپی بچپن میں ہی پیدا ہوگئی تھی۔ اُنہوں نے ریاست سے اوّلین اخبار نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام ہوئے۔ انہوں نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ جن میں داستان جگت روپ، تحفہ سالک، شاستر ارتھ، مورتی منڈن، دھر اُپدیش، سوانح عمری مہاراجہ گلاب سنگھ،

(۱) ناول کی تاریخ اور تنقید از علی عباس حسینی

خطرۂ تعلیم (تعلیم نسواں پر کتاب) کے علاوہ کئی اور چھوٹی بڑی کتابیں منظرِ عام پر لائیں۔

سالک اُردو کے اوّلین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد سے متاثر تھے۔ اُن کی تصانیف میں داستان جگت روپ اور تحفہ سالک قصے کے پیرائے میں لکھی گئی دو تصانیف ہیں جن میں داستانی رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ دونوں تصانیف ریاست جموں وکشمیر میں اُردو ناول کے اوّلین نقوش تصور کیے جاتے ہیں۔ "داستان جگت روپ" اُنہوں نے قلعہ باہو کے قید کے زمانے میں لکھی گئی ایک دلچسپ قصہ نما داستان ہے۔ اسی طرح سے تحفۂ سالک بھی اُن کا ایک اور نثری کارنامہ ہے جو تواریخ اور سفر نامہ دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی کتاب کشمیر کے دو ادیب۔ دو بھائی میں سالک کے قصہ جگت روپ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "سالک کی اس داستان کا محرک کون سا افسانہ ہوا۔ اس کا پتہ نہیں چلتا، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انکی مثنوی سندر بدن کا محرک میر حسن کی سحر البیان ہوئی۔ اس فسانہ کا محرک غالباً رجب علی بیگ سرور کا فسانہ عجائب ہوا۔ اس کا ثبوت داستان جگت روپ کا اسلوب بیان ہے جو کافی حد تک مسجع اور مقفیٰ ہے۔" (۱)

اس اقتباس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ داستان جگت روپ اور تحفۂ سالک ریاست میں اردو ناول نگاروں کا پہلا پڑاؤ ہے۔ منشی محمد الدین فوق (۱۸۷۷۔۱۹۴۵ء) سالک کے ساتھ ہی اُبھرے۔ وہ ایک سو کے قریب چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں۔ صحافت کے میدان میں بھی اُن کے رول کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی، تذکرہ نویس بھی اور تاریخ دان بھی، ناول نگار بھی اور محقق بھی لیکن ان کا پہلا عشق صحافت تھا۔ فوق نے ۱۹۰۰ء میں انارکلی اور اس کے تقریباً ۹ سال کے بعد ۱۹۰۹ء میں اکبر کے نام سے دو تصانیف لکھیں۔ یہ دونوں تاریخی قصے ہیں اور ناول کے پیرائے میں

(۱) پروفیسر عبدالقادر سروری کشمیر کے دو ادیب [illegible]

لکھے گئے ہیں۔ جن میں داستانی رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کے دوسرے ناولوں میں ناصح مشق، نیم حکیم خطرۂ جان، غریب الدیار، اور ناکام کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان ناولوں میں اصلاحی رجحان پایا جاتا ہے۔ فوق کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ وہ فرضی باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے بلکہ حقائق کو سامنے لاکر ہی دم لیتے تھے۔ اسی لئے ان کے ناولوں میں حقیقت پسندی کا جذبہ ملتا ہے۔ ''اکبر اور انار کلی'' میں انہوں نے یہی جذبہ روا رکھا ہے۔ ان کے یہ دونوں ناول بقول ڈاکٹر برج پریمی بیسویں صدی کے اوّلین ناولوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ (۱) فوق نے یہ ناول اُس زمانے میں لکھے جب امتیاز علی تاج کا شہرہ آفاق ڈراما ''انار کلی''، ابھی منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اس طرح سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا وژن کتنا وسیع تھا۔ فوق حقیقی معنوں میں بے باک قلم کار تھے۔

وشوا ناتھ درماہ، موہن لال مارواہ، شمبھو ناتھ ناظر، نند لال در بے عرض اور کاشی ناتھ ترچھل ریاست کے بعض اچھے ناول نگار ہیں۔ جنہوں نے سالک اور فوق کی روایت کو آگے بڑھانے میں کافی پیش رفت کی اور بعض اچھے ناول منظر عام پر لائے۔ ان میں سے بعض ناول مقامی اخبارات میں قسط وار شائع ہوئے اور لوگوں کی دلچسپی کا باعث بن گئے۔ یہ دور ایک نیا دور تھا۔ پریم چند کے بعض افسانے اور ناول منظر عام پر آنے لگے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری بھی دُنیائے ادب میں نام کما چکے تھے اور ریاست کے ناول نگاروں میں ایک نیا جوش پیدا ہو چکا تھا۔ موہن لال مارواہ اسی دور کے ایک باصلاحیت ناول نگار تھے۔ جو قصوں اور داستانوں سے انتہائی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کا ناول داستانِ محبت، ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عشق و محبت کی تب و تاب نظر آتی ہے۔ موہن لال مارواہ کے ہمعصر وشوا ناتھ ورماہ کا ناول تلاش حقیقت، بھی ایک صاف ستھرا اور دلچسپ ناول ہے اس ناول میں روایتی رنگ غالب ہے۔ لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے خیالات میں اپنی بات اس طرح پیش کی ہے کہ گراں نہیں

(۱) ڈاکٹر برج پریمی: جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما، ص ۹۳

گزرتی۔ اگرچہ ناول میں زیادہ تر قصہ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ناول نگار نے اپنے جذبات اور اسلوب بیان سے اس میں ایسے رنگ بھر دیئے ہیں کہ ایک نئی فضا سامنے آجاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کا مشاہدہ گہرا ہے اور انہوں نے اس دور کے بعض اہم ناول نگاروں کا اثر قبول کیا ہے۔

نندلال در بے غرض ایک اور ناول نگار ہیں جنہوں نے ناول لکھنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے۔ تازیانہ عبرت ، ان کا مکمل اور مربوط ناول ہے۔ جو مقامی اخبارات میں قسط وار شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ بے غرض ایک منجھے ہوئے ناول نگار تھے وہ رتن ناتھ سرشار سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ وہ قصہ گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور انہیں کہانی پن کا احساس بھی تھا۔ وہ سرشار کے ناول فسانۂ آزاد کا گہرے طور پر مطالعہ کر چکے تھے۔ اسی لئے ان کے ناول میں فسانہ آزاد کی طرح داستانی رنگ ملتا ہے۔ اگر ان سے زندگی وفا کرتی تو ان کے قلم سے اور بھی اچھے ناول صفحۂ قرطاس پر آجاتے۔ کاشی ناتھ ترچھل خوشتر ایک منجھے ہوئے ناول نگار تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور شاعری میں خوشتر تخلص کرتے تھے۔ ان کا ناول گوری شنکر کے نام سے اس دور میں شائع ہوا جس دور میں ریاست میں قصہ گوئی اور داستان سرائی کا رنگ کم ہونے لگا تھا اور مغربی ناول کے اثرات اردو میں آہستہ آہستہ اثر انداز ہونے لگے تھے۔ اسی لئے ترچھل کے ناول میں قصہ پن کم ملتا ہے۔ انہوں نے ناول میں جذباتیت سے کام نہیں لیا بلکہ صحیح معنوں میں ناول کی تکنیک برت کر اپنے خیالات میں اور بھی پختگی پیدا کی۔

اس دور تک آتے آتے برصغیر ہندوپاک میں ناول نگاری کے میدان میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بہت سے نئے ناول نگار پیدا ہوئے جنہوں نے اُردو ناول کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر یہ ناول نگار اپنے خیالات کو وسیع تناظر میں پیش کرنے کا ایک خاص ملکہ رکھتے تھے۔ پریم چند ایک کامیاب ناول نگار تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ناول اردو اور ہندی ادبی دنیا میں خراج حاصل کر چکے ہیں۔ جلوۂ ایثار،

بیوہ، نرملا، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، میدانِ عمل، اور گئودان ان کے بعض اہم ناول تصور کیے جاتے ہیں۔ ان ناولوں سے ناول نگاری کے میدان میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی ناول زیادہ ترقی یافتہ شکل میں سامنے تھا۔ اس لئے ہمارے یہاں ریاستی سطح پر بھی بعض ایسے ناول نگار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے تخلیقی جوہر سے اس شعبے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ چنانچہ پریم ناتھ پردیسی، تیج بہادر بھان، کشمیری لال ذاکر، نرسنگھ داس نرگس، ٹھاکر پونچھی وغیرہ جیسے ناول نگار سامنے آئے جنہوں نے پریم چند، احمد علی، اُوپندر ناتھ اشک، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، اعظم کریوی اور سدرشن سے متاثر ہوکر ناول نگاری کے میدان کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔

پریم ناتھ پردیسی (۱۹۰۹ء۔۱۹۵۵) ریاست جموں وکشمیر کے سب سے بڑا اور سب سے منجھے ہوئے افسانہ نگار تصور کیے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا۔ وہ پہلے رونق تخلص کرتے تھے لیکن یہ صنف انہیں راس نہیں آئی۔ وہ نثر میں لکھنے لگے اور اپنے افسانوں سے دُنیائے ادب میں منفرد مقام پیدا کیا۔ پریم ناتھ پردیسی اول اول تو پریم چند کے رومانی افسانوں سے متاثر تھے۔ وہ ٹیگور کے فنکارانہ صلاحیت کے بھی قائل تھے۔ پردیسی ایک حقیقت نگار تھے۔ وہ سماج کی حقیقی تصویر کاغذ پر اتارنے کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے موضوعات توہم پرستی، نوکر شاہی، رشوت خوری، عوام کی بدحالی، فرسودہ سماجی بندشیں تھیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات سے انسان دوستی، زندگی اور امن وآشتی کا پیغام دیا ہے۔ اسی لئے انہیں کشمیر کا پریم چند بھی کہا جاتا ہے۔ پردیسی نے ۱۹۴۷ء سے قبل ایک ناول ''پوتی'' کے نام سے لکھا۔ یہ ناول لاہور کے ناجو نامی ایک پبلشر نے قومی کتب خانہ لاہور سے شائع کیا جو پردیسی کے گہرے دوست تھے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ خط وکتابت کا سلسلہ ٹوٹ گیا لہٰذا اس ناول کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہ ہوسکی۔ ڈاکٹر برج پریمی، جو پردیسی کی شخصیت اور فن پر وقیع تحقیقی کام کرچکے ہیں، اپنی کتاب جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"۱۹۴۷ء سے قبل پریم ناتھ پردیسی نے افسانہ نگاری کے علاوہ ناول کو بھی اپنی جولاں گاہ بنایا۔ انہوں نے ایک بھرپور ناول پوتی کے نام سے لکھا لیکن قبل اس کے کہ اس ناول کا کوئی حصہ شائع ہوتا، انہوں نے یہ مسودہ لاہور کے ایک پبلشر ناجو کو بھیج دیا تھا۔ جنہوں نے قومی کتب خانہ لاہور سے اسے شائع بھی کیا تھا لیکن تقسیم کے دوران تلف ہوا، اس طرح سے ہم ایک اچھے ناول کے مطالعے سے محروم رہے۔" (۱)

اس بات کی تصدیق پردیسی کے فرزندار جمند سوم ناتھ سادھو (مرحوم) بھی ڈاکٹر برج پریمی کے نام اپنے ایک خطہ میں یوں کرتے ہیں:۔

"تقسیم سے پہلے لاہور میں ایک مشہور پبلشنگ ہاؤس ہوا کرتا تھا جس کا نام تھا قومی کتب خانہ۔ اُس کے مالک تھے ناجو۔ پردیسی صاحب اور ناجو صاحب کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ کئی بار وہ ہمارے گھر فتح کدل بھی آئے اور وہاں کھانا بھی کھایا۔ ان کے کہنے پر پردیسی صاحب نے بچوں کے لئے لکھنا شروع کیا۔ چار بیٹے، چورنگی، جانباز بچے (کہانیوں کی کتابیں) اور ایک ناول پوتی اسی کتب خانے سے چھپوا دیں۔" (۲)

بہر حال اگر پردیسی کا ناول تلف نہ ہوا ہوتا تو ریاست میں اردو ناول نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا اور افسانہ نگاری کی طرح ان کا نام ناول نگاری کے میدان میں بھی معتبر مقام کا حامل ہوتا۔

پردیسی کے ساتھ ساتھ جو ناول نگار ریاست کے جدید ناول نگاری کے افق پر نمودار

(۱) جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما: از ڈاکٹر برج پریمی۔ ص

(۲) پریم ناتھ پردیسی۔ عہد شخص اور فنکار، از ڈاکٹر برج پریمی۔ ص ۱۸

ہوئے ان میں رامانند ساگر، تیج بہاردبھان، کشمیری لال ذاکر، اور ٹھاکر پونچھی کے نام بھی لئے جاسکتے ہیں۔ان ناول نگاروں کی تخلیقات نہ صرف ریاست میں بلکہ ریاست سے باہر بھی چھپتی رہیں۔اور وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ یہ مختلف موضوعات پر ناول لکھتے رہے اور ایک عرصہ تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔

رامانند ساگر فلمی دُنیا میں مصروف ہوگئے۔ وہ کئی ناول تخلیق کر چکے ہیں۔انہوں نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ برقرار رکھا۔ ان کا ناول ''اور انسان مر گیا'' ریاست میں ناول نگاری کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔فسادات کے موضوع پر یہ ناول دل کو دہلا دینے والا ناول ہے۔ جو کافی عرصہ تک متنازعہ فیہ رہا اس ناول کے پیش لفظ میں معروف فلم ساز اور ادیب خواجہ احمد عباس رقمطراز ہیں:۔

> ''یہ ہنگامہ لٹریچر نہیں، ایک کلاسیک ہے۔اس کے قلم سے
> نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہے۔
> اس میں آپ خوب پہچان لیں گے کہ انسانیت کی مرنے کے بعد
> شکل کیا ہوتی ہے۔''

پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) کے مطابق تقسیم ملک کے دوران فسادات کا المیہ ساگر کے اس ناول کا موضوع ہے۔جس میں انسان کی روح کا کرب بیان کیا گیا ہے۔ ساگر ایک بیباک قلم کار تھے۔اُنہوں نے اپنے اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان سیاست کا کس طرح سے شکار ہوتا ہے اور فساد کی ایک چنگاری سے سارا ملک لپیٹ میں آجاتا ہے۔ انسان انسان نہیں رہتا بلکہ دہشت، درندگی، خون ریزی، قتل وغارت، اُس کا ایمان بن جاتا ہے۔ساگر نے یہ ناول انسانی جذبات کو اُکسانے پر خاطر نہیں لکھا ہے بلکہ یہ ناول فسادات پر لکھے گئے ناول میں اہم مقام رکھتا ہے۔

ساگر اس کے بعد فلمی دُنیا میں معروف ہوگئے۔اُن کا کوئی تخلیقی کارنامہ منظر عام پر

نہیں آیا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی بعض فلموں میں ادبیت کے جوہر آسانی سے تلاش کیئے جاسکتے ہیں۔ ساگر نے اس ناول کے ذریعے سے اپنے ملک کے لوگوں کو ملک وقوم کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔

کشمیری لال ذاکر (۱۹۲۱ء) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ اُردو کے معروف ناول نگار ہیں جس کا تخلیقی سفر ایک لمبے عرصے پر محیط ہے۔ ذاکر نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا لیکن بعد میں وہ نثر کی طرف راغب ہوئے اور افسانہ اور ناول نگاری کو اپنی جولاں گاہ بنایا۔ وہ خاکہ نگاری میں بھی کمال رکھتے ہیں لیکن بحیثیت افسانہ اور ناول نگار کے ان کا نام دور دور تک چلا گیا۔ وہ کشمیر کے پس منظر میں ناول لکھنے کا ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کشمیر میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ سندور کی راکھ، سمندر صلیب اور وہ، کرماں والی، انگوٹھے کا نشان، دھرتی سدا سہاگن، لمحوں میں بکھری زندگی، جاتی ہوئی رات، خون پھر خون ہے، ڈوبتے سورج کی کتھا، چھٹی کا دودھ، چار میل لمبی سڑک اور آدھے چاند کی رات وغیرہ اُن کے بعض اہم ناول ہیں۔ جن میں کشمیر کی خوشبو نظر آتی ہے۔ وہ سماج میں بدعتوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ رشوت خوری اور مذہب کے نام پر استحصال ان کے عزیز ترین موضوعات ہیں وہ صاف ستھرے نظام کے خواہاں ہیں۔ اُن کے دِل میں صحیح معنوں میں انسان کے لئے درد بسا ہوا ہے۔ اُن کے ناول ہندو مسلم برادری، قومی ایکتا اور وطن سے محبت کے موضوعات پر محیط ہیں۔ ذاکر کے ناولوں میں کشمیر کی منظر کشی شدومد کے ساتھ ملتی ہے۔ ان میں رومان کی ہلکی پھلکی جھلکیاں بھی ملتی ہیں لیکن ان کے اکثر ناول یہاں کے محنت کش عوام کے درد کا مداوا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں ذاکر کے ناولوں میں موضوعات کی تنوع پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''ان میں سے کئی ناول کشمیر کے پس منظر میں ہیں۔ ذاکر کا فکشن ہیت کے نئے تجربوں کے باعث نہیں، اپنے متنوع موضوعات کے لئے بھی اہم ہیں۔ ان کے ناولوں میں انسانی

زندگی کے بیکل باطن کی بے چینی کا شدید احساس ہوتا ہے اور سماج اور معاشرے کی وہ بدصورتی بھی جس نے غم اور ملال کا زہر گھول دیا ہے، کھل کر بے نقاب ہو جاتی ہے۔" (۱)

اس ضمن میں اُن کے تازہ ترین ناول آدھے چاند کی رات کے چند اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے اُن کا تصور کشمیر کی بازیافت ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

- "میں اُس سے پہلے بھی توڈل کی سیر کر چکا تھا۔ تیرتے ہوئے کھیتوں اور پانی میں کھلے کنول کے بہت بڑے بڑے پھولوں کی خوبصورتی کا لطف بھی تو اُٹھا چکا تھا۔ لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ آج میں پہلی بار ایک اچھے شکارے میں بیٹھا تھا۔" (۲)
- "کلہن پنڈت نے راج ترنگنی کو ۱۱۴۸ بعد مسیح میں لکھنا شروع کیا اور اسے ۱۱۵۰ بعد مسیح میں مکمل کر دیا۔ اُس نے اس کتاب میں ۲۳۳۴ سالوں کی کشمیر کی تاریخ کا احاطہ کیا ہے۔ کلہن پنڈت نے اس تاریخ کا آغاز ۱۱۸۴ قبل سے کیا ہے۔ اس سے پہلے کے ۱۲۶۶ سالوں میں قریب قریب ۵۲ راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں کسی قسم کا ریکارڈ موجود نہیں۔ چنانچہ کلہن نے راج ترنگنی کا راجہ گونانده سوم سے کیا ہے جو ۱۱۸۴ قبل مسیح میں کشمیر پر حکمران تھا۔" (۳)

ان اقتباسات سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر کشمیر سے والہانہ عقیدت ہے۔ اُنہیں یہاں کی تاریخ پر بھی وسیع نظر ہے اور کشمیر کے کلچر تہذیب اور تمدن کا بھی وہ گہرا ادراک رکھتے ہیں۔

لالہ نرسنگھ داس نرگس (۱۹۰۲ء) ایک منجھے اور معتبر صحافی کے طور پر جانے اور پہچانے

(۱) جموں و کشمیر میں اُردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۴۵

(۲-۳) آدھے چاند کی رات: از کشمیری لال ذاکر، ص ۳۴

جاتے ہیں وہ ایک بہترین افسانہ نگار، مورخ اور ناول نگار کے طور پر بھی اُردو کے ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ وہ کافی عرصہ تک ہفتہ روزہ ''چاند'' بھی پابندی کے ساتھ نکالتے تھے۔ ڈوگرہ شاہی کی تاریخ نرگس کا ایک اور کارنامہ ہے۔ جو ۱۰۵۲ء میں شائع ہوئی۔ ''دُکھیا دیس'' ان کے سدابہار افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ریاست کے نمائندہ افسانہ نگار کے افسانے شامل ہیں۔ نرگس کے تین ناول شائع ہو چکے ہیں جن میں پاربتی، نرملا اور جانکی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ وہ پریم منوہر، ممولا رام کوٹی اور رئیس التحریر کے ناموں سے بھی لکھتے تھے۔

نرگس کا ناول پاربتی نومبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا اور نرملا بھی اپریل ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اُن کا ایک ناول جانکی اسی دور کے آس پاس شائع ہوا۔ تینوں ناول میں الگ الگ کردار نظر آتے ہیں۔ نرگس جہاں پریم چند سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہاں شرت چندر چٹرجی اور گرو دیورابندر ناتھ ٹیگور کے اثرات بھی ان کی تخلیقات میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ پاربتی کی کہانی ایک دیہاتی کہانی ہے۔ اس میں دیہاتی مسائل نظر آتے ہیں۔ گیان چند ناز پڑولوی، نرگس کے اس ناول کو دیہاتی عوام کی سماجی زندگی کا ایک بہترین مرقع بتاتے ہیں۔ وہ ناول کے دیباچے میں اس بات کا احساس یوں دلاتے ہیں:۔

> ''جہاں کہانی میں دیہاتی عوام کی سماجی زندگی، مجلسی رسم ورواج اور ان کی طرز معیشت پر ایک واضح روشنی ڈالی گئی ہے وہاں دیہاتی ماحول کے جذباتی نظریات اور ذہنی احساس کو نہایت خوبصورت اور صحت مندانہ طریق پر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ کوہساروں کے دامن میں دور اُفتادہ وادیوں میں اور زرخیز گھاٹیوں میں بسنے والے لوگوں کے اخلاقی اور سوشل کردار کا ایک حسین تصور آپ کو اس ناول کے مطالعہ میں نظر آئے گا۔''(۱)

(۱) پاربتی از پریم منوہر۔ ص ۵

نرگس خود دیہاتی ماحول میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔اسی لئے اُن کے ناولوں میں دیہاتی ماحول کا عکس جگہ جگہ نظر آتا ہے۔لوگوں کی کسمپرسی اُن کے اقتصادی حالات، ان کے رسم ورواج کے ساتھ ساتھ ان ناولوں میں ڈوگرہ کلچر، تہذیب اور تمدن کی بھرپور جھلکیاں ملتی ہیں۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نرگس اپنے دور کے کامیاب ناول نگار تھے۔ پلاٹ کی خوبصورتی، زبان وبیان کی سادگی اور جذبات کی لطافت نرگس کے ناولوں کا حاصل ہے۔ڈاکٹر برج پریمی، نرگس کے ناول نگاری کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:۔

> ''اُنہوں نے اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور سماج کی بدعتوں کی تصویر کشی کی۔ نرگس خاص طور پر دیہاتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔اُنہوں نے چونکہ عمر عزیز کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں گزارا ہے اس لئے ان کے ناولوں کے کردار ایسے لوگ ہیں جو رسم ورواج کی چوکھٹ پر قربان ہونے پر مجبور ہوتے ہیں..........نرگس اپنے ناولوں میں اپنے اصلاحی مقصد کو پیش کرتے ہیں۔''(۱)

ٹھاکر پونچھی خطہ جموں سے تعلق رکھنے والے ایک اور ناول نگار ہیں۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور ''راجہ'' کے نام سے اپنا پہلا افسانہ لکھا جو کالج میگزین ''توی'' میں شائع ہوا اور پسند کیا گیا۔وہ ایک منجھے ہوئے ناول نگار بھی تھے۔ان کے بہت سے ناول شائع ہو چکے ہیں اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔رات کے گھونگھٹ، وادیاں اور ویرانے، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، چاندنی کے سائے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، چاندی کے ہاتھ پٹ، جھڑ کے بچھڑے، گونگے ہونٹ، اب میں وہاں نہیں رہتا، زندگی کو دوڑ، اور زلف کے سر ہونے تک، اُن کے بعض اچھے اور سبق آموز ناول ہیں۔ٹھاکور کا

(۱) جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما از ڈاکٹر برج پریمی، ص ۴۴

پہلا ناول رات کے گھونگھٹ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔اس ناول کی مقبولیت کے بعد وہ بے تکان لکھتے رہے۔ٹھاکر اردو کے معروف افسانہ نگار کرشن چندر سے متاثر ہیں۔ وہ رنگارنگ موضوعات برتنے کے قائل ہیں۔ پلاٹ، کی چابکدستی، کرداروں کی رنگارنگی اور موضوعات کی خوبصورتی ان کے ناولوں میں بہ درجہ اُتم پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے رومانی قصوں اور کہانیوں سے اپنا سفر شروع کیا عشق ومحبت کی پائیداری ، زبان وبیان کی مٹھاس، اور تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال ان کا خاصا رہا ہے۔ وہ جہاں خوبصورت مناظر کی بات کرتے ہیں وہاں ان کے ناولوں میں طبقاتی کشمکش، سماجی اور مذہبی استحصال اور زوال پذیر معاشرے کا عکس نظر آتا ہے۔ان کے ہاں منجھا ہوا اسلوب ملتا ہے۔ وہ خوبصورت زبان کے مالک ہیں اور اپنے ناولوں میں پلاٹ کو بہترین انداز میں برتنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ حقائق سے کام لیتے ہیں اور سماج کے چھوٹے پردوں کو چاک کر کے انسان کے مسائل کو اُجاگر کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ٹھاکور اپنے ناولوں میں عوام کو حقیقت سے روشناس کرتے ہیں اور انہیں سچے اور سیدھے راستے پر چلنے کا درس دیتے ہیں۔ اُن کے دوسرے ناول یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل اور چاندی کے سائے میں ایسے مناظر پیش کئے گئے ہیں جن سے انسان نہ صرف رومان کی وادیوں میں کھو جاتا ہے بلکہ اس کے سامنے یادوں کا سارا منظر اُمنڈ کے آتا ہے۔ وہ سماج کے رستے ہوئے ناسور کی عکاسی کرتے ہیں۔ ٹھاکر منظر کشی میں جواب نہیں رکھتے۔ وہ الفاظ کے تانے بانے سے اپنی کہانی میں نئی روح پھونک دیتے ہیں ان کے ناولوں میں نئی نئی تشبیہات اور استعارات کا ایک حسن امتزاج ملتا ہے۔

خوبصورت پلاٹ، متوازن کردار، اور ڈرامائی عناصر کا تانا بانا ان کے ناولوں میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ ٹھاکر کردار نگاری اور ڈرامانگاری کا گُر بخوبی جانتے ہیں ان کے کردار خوبصورتی سے اپنا رول نبھانے کے فن میں ماہر ہیں اور یہی خصوصیت ان کے معتبر ناول نگار بنا دیتی ہے۔ ریاست کے دوسرے ناول نگاروں میں حامدی کاشمیری، علی محمد لون، غلام رسول سنتوش، نور شاہ، مدن موہن شرما اور صوفی محی الدین کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

حامدی کاشمیری ایک معتبر شاعر اور قابل قدر نقاد اور محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے ادب کی دوسری اصناف یعنی ڈراما نگاری، افسانہ نگاری کے علاوہ ناول نگاری میں بھی اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ اُن کے ناول بہاروں میں شعلے، بلندیوں کے خواب، اور برف میں آگ برسوں پہلے شائع ہو چکے ہیں اور ادبی دُنیا سے خراج حاصل کر چکے ہیں۔ وہ پرچھائیوں کا شہر کے نام سے ایک ناولٹ بھی لکھ چکے ہیں اور ادب کے اس میدان میں بھی اپنی فنکارانہ چابکدستی سے چھاپ ڈال چکے ہیں۔ حامدی کے نظریات میں بعد کے برسوں میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ وہ پہلے ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ لٰہذا ان کے ناولوں میں ترقی پسندی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، بیدی اور عصمت کے فن سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ منشی پریم چند سے بھی کافی متاثر نظر آتے ہیں اور رومانی دور کے فنکاروں کے فن کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ بلندیوں کے خواب، بہاروں میں شعلے اور برف میں آگ۔ جیسے ان کے ناولوں میں خوابوں کی دُنیا نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی زندگی کی کہانیاں بھی صفحۂ قرطاس پر لانے کے روادار ہیں۔ اس طرح سے خواب اور حقیقت کا امتزاج حامدی کے ناولوں میں بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ پرچھائیوں کا شہر، میں ناول نگار مکمل طور پر تبدیل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں عصری آگہی کا شعور بھی ملتا ہے اور ترقی پسند رجحان بھی وہ انسان کا درد کھل کر بیان کرتے ہیں اور اپنی بات صاف اور واضح الفاظ میں قارئین تک پہنچاتے ہیں۔

غلام رسول سنتوش، حامدی کے ساتھ ساتھ ہی اُبھرے۔ وہ متنوع دلچسپی کے مالک ہیں۔ سنتوش بنیادی طور پر ایک مصور ہیں۔ انہوں نے اس شعبے میں اپنے کارہائے نمایاں سے انقلاب لایا اور نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ممالک میں بھی اپنا ایک ممتاز مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ مصوری کے علاوہ وہ ایک شاعر، افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل قدر ناول نگار بھی ہیں۔ ان کا ناول سمندر پیاسا ہے بہت پہلے شائع ہو چکا ہے اور ادبی دُنیا سے خراج حاصل کر چکا ہے۔ سنتوش کا یہ ناول بہ ظاہر ایک بیانیہ ناول ہے۔ لیکن

اس میں چشمہ شعور کی تکنیک کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔ یہ تکنیک مغرب میں جیمس جائس اور ورجنیا ولف کے ناولوں میں ملتی ہے۔ اردو ناول نگاری میں اس تکنیک کو سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اپنے ناول لندن کی رات میں اپنایا اس کے بعد بہت سارے ناول نگاروں نے اپنے نالوں میں اس تکنیک کو برتا اور اس صنف میں ایک نیا انقلاب لایا۔ سنتوش بھی اس تکنیک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ''سمندر پیاسا ہے''۔ میں ناول نگار نے انسان کے اندر جھانک کر اس کے چھپے ہوئے درد کا مداوا کیا ہے۔ دراصل یہ ناول انسان کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ جس میں انسان کا مکر وفریب، اس کی لالچ اور بدکاری وبددیانتی سامنے آجاتی ہے۔ سنتوش پھر مصوری کی دنیا میں معروف ہو گئے لہٰذا انہوں نے ناول کی صنف اور کوئی ناول نہیں لکھا۔ بہر حال اُن کا ناول سمندر پیاسا ہے ریاست کے ناول نگاری کے شعبے میں اضافہ ہے۔

علی محمد لون بھی سنتوش کی طرح متنوع دلچسپیوں کے مالک ہیں۔ وہ سرزمین کشمیر کے ایک بڑے اچھے اور باصلاحیت ڈراما نگار بھی تھے۔ ڈراموں کے ساتھ ساتھ انہوں نے افسانہ نگاری میں بھی نئے نئے گل بوٹے کھلائے اور علمی وادبی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کیا۔ لون ایک قابل قدر ناول نگار بھی ہیں۔ ان کا ناول شاید ہے آرزو تیری، ستمبر ۱۹۶۲ء میں پہلی بار چاند پریس جموں سے شائع ہوا۔ یہ ناول ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں دلی کی فضاؤں میں رہنے بسنے والے کشمیریوں کی چیخیں سننے میں آتی ہیں۔ ان فضاؤں میں کشمیر سے آئے ہوئے ایک نوجوان نامساعد حالات کے شکنجے میں پھنس کر اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ وہ ایک شریف اور متین نوجوان ہے جو پردیس میں آکر تیز رفتار ماحول میں گم ہوجاتا ہے۔ ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے جس میں معاشرے کا قریب نزدیک سے دیکھنے کا موقعہ فراہم ہوتا ہے۔

''ترکمان دروازے کی محراب کے نیچے کوئی نہ تھا۔

چارپائیاں دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں لیکن کوئی سنتری تھانہ کوئی

نائی۔ اس سے آگے سارا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ اندھیارے اور قمقموں کی روشنی کا اعجاز پٹواڑی کی دکان کھلی تھی لیکن وہ وہاں نہ تھا۔ چاندنی موتری کے قریب بیٹھی تھی۔ پاس کے کھمبے کا قمقمہ اُس پر اپنی روشنی نچھاور کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر رک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ کان پھڑ پھڑ ائے اور کھڑی ہو کر میری طرف چلی آئی۔ میں نے اس کے کانوں کو چھولیا۔ اس کے ماتھے کو سہلایا۔ پیٹھ کو تھپ تھپایا۔ کچھ راہ گیر میری حرکت دیکھ کر رک گئے اور حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ سوٹ بوٹ پہنا ہوا ایک جنٹل مین گدھی کو یوں التفات کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ میں نے چاندنی کی پیٹھ پر سے ہاتھ اٹھایا۔ اس نے اپنی گردن کو جھٹک دیا۔ گویا کہہ رہی ہو۔ بابو۔ ہاتھ کیوں روک لیا؟ یاد آئی اپنی سفید پوشی؟'' (۱)

ناول نگاری سے ہر دور میں تخلیق کاروں کی دلچسپی رہی ہے۔ اگر چہ بہت کم ناول منظر عام پر آتے رہے لیکن ہر دور میں ناول نگاروں نے اس صنف کی آبیاری کی۔ اس دور میں بھی جب کہ قلم کار افسانہ نگاری اور شاعری کی طرف خاص طور پر مائل تھے ناول نگاری کی طرف دلچسپی لینے لگے اور اردو ادب میں بعض اچھے ناول سامنے آئے۔ اس طرح سے ریاست میں اردو ناول ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں مالک رام آنند، کا اولین ناول نئے خدا کے نام سے شائع ہوا۔ اس ناول کو بھی ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ اس کے بعد ان کے بعض اور ناول سامنے آئے جن میں دہکتے پھول شبنم آنکھیں، صلیب اور دیوتا، اور اپنے وطن میں اجنبی شامل ہیں۔ جن کی اہمیت مسلم ہے۔

ریاست کے دوسرے ناول نگاروں میں برج کتیال کا ناول چراغ بجھنے سے پہلے،

(۱) شاہد ہے تیری آرزو: علی محمد لون، ص ۴۲

مدن موہن شرما کا ایک منزل چار راستے، اور پیاسے کنارے، کرن کاشمری کے ناول خوابوں کے قافلے اور رات اور زلف، صوفی محی الدین کا ناول بکھر گئے سب تنکے، شبنم قیوم کا ناول چراغ کا اندھیرا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام ناول انسانی زندگی کے دردناک پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں اور قارئین کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض ناولوں میں سماجی برائیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعض ناولوں میں اہم سماجی اور نفسیاتی مسائل کو ابھارا گیا ہے۔ بعض ناولوں میں سیاسی کارندھوں پر طنز کے تیر چلائے گئے ہیں اور بعض انسانی زندگی کی ناہمواریوں کو پیش کرتے ہیں۔ کسی میں عشق و محبت کی داستان ہے اور کوئی انسانی زندگی کے اہم مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ''چراغ کا اندھیرا'' کشمیر کے بارے میں واضح تصور پیش کرتا ہے اور اپنے دور کا اہم ناول ہے۔ نور شاہ بھی ناول نگاروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن انہوں نے ڈرامے اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ جن کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ وہ ایک قابل قدر ناول نگار بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنے ناولوں میں کشمیر کی خوبصورتی کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ چونکہ وہ ایک حقیقت نگار بھی ہیں اور فرضی قصوں اور کہانیوں پر یقین نہیں کرتے ان کے ناولوں میں سماج کے متوسط طبقے کی نمائندگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں کشمیر کے حقیقی کرداروں کی ریل پیل ملتی ہے۔ جن میں ہانجی بھی ہیں اور کسان اور مزدور بھی، ملازم بھی ہیں اور سیاسی کارکن بھی، نیلی جھیل کالے سائے، پائل کی زنجیر ان کے دو ناول ہیں۔ جن میں کشمیر کی ہری بھری اور شاداب وادی کا حسن ملتا ہے۔ نور شاہ کے قلم میں جادو ہے وہ بات کو گھما پھرا کر کہنے کے قائل نہیں بلکہ ان کے ناولوں میں خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ سماج میں رستہ ہوا درد بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔ ان کا ناولٹ آؤ سو جائیں، بھی انسانی درد و کرب کی ان گنت ٹیس اُجاگر کرتا ہے۔ خواتین ناول نگاروں میں فرحت آرا حیدری ریاست کی ایک اہم اور پہلی خاتون ناول نگار ہیں۔ وہ دراصل لکھنؤ میں پیدا ہوئیں لیکن ازدواجی زندگی کے بعد کشمیر میں رہائش پذیر ہوئیں۔ ان کے چار ناول شائع ہو چکے

ہیں جن میں اپنا اپنا نصب، عرفان، کوثر و تسنیم، اور چاند کے پار چلو وغیرہ ناول شامل ہیں ناول عرفان پر انہیں اردو اکادمی (یو پی) نے گراں قدر اعزاز سے نوازا۔ ان ناولوں میں خاص طور پر خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' سے ناول نگاری کے میدان میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور تک آتے آتے اردو ناول نے کئی منازل طے کئے تھے۔ اردو میں بعض بہترین ناول کا اضافہ ہو گیا۔ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ملکی سطح پر بھی اس شعبے میں نہایت ہی عمدہ کارنامے انجام دیئے گئے نئے ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، قاضی عبدالستار، عبدالصمد، شفق وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے عصر حاضر میں ناول نگاری کے میدان میں ایک نیا انقلاب لایا اور بقول پروفیسر قمر رئیس یہ ہے جدید اردو ناول کا سرمایہ جو اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے کسی طرح مایوس کن نہیں (۱) ریاست جموں و کشمیر کے ناول نگاری میں بھی ادب کی بدلتی ہوئی رو کے اثرات پیدا ہو گئے یہاں کے ناول نگار اپنے ماضی کی شاندار روایات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ جدید رجحانات کے باوجود یہاں کے ناول نگار کرشن چندر بیدی، اور قرۃ العین حیدر کے اثرات سے دامن بچا نہ سکے اور بقول پروفیسر قمر رئیس نیا ادیب اسی عرفان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حال کی تلاش میں وہ سب سے پہلے ماضی کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ (۲) ریاست جموں و کشمیر میں بعض ایسے ناول نگار بھی پیدا ہوئے جو روایت کو بھی آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے اور جدید میلان کو بھی ملحوظ خاطر لایا۔ ان میں سے چند ناول نگار اگر چہ وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بدل گئے، لیکن بعض لوگوں نے تکنیک کے نئے تجربے کئے اور بعض لوگوں کا ٹریٹمنٹ دوسروں سے جداگانہ ہے لیکن وہ ناول نگاری کے اصولوں اور اس کی فارمولا سے کنارہ کش نہیں ہوئے ان کے ناولوں میں کہانی پن برقرار ہے اور یہ ناول ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ایسے ناول نگاروں

(۱،۲) تلاش وتوازن از پروفیسر قمر رئیس، ص ۶۷ اور ۶۸

میں کرن کاشمیری مالک رام آنند، فاروق رینزو، ڈی کے کنول، آنند لہر، جان محمد آزاد، بھوشن لال بھوشن، وجے سوری، نذیر مشتاق، عمر مجید، رشید پروین، وحشی سعید ساحل، اوپی سارتھی، پرویز مانوس، اور سجاد حسین کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

مالک رام آنند ایک باصلاحیت قلمکار تھے۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے اور شاعر بھی۔ انہوں نے ناول نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ دہکتے پھول شبنم آنکھیں، اپنے وطن میں اجنبی نئے دن پرانے سال ان کے بعض اہم اور قابل مطالعہ ناول ہیں۔ ان کا ناول اپنے وطن میں اجنبی ایک جاندار ناول ہے۔ جس میں تکنیک کے نئے تجربے ملتے ہیں۔ اس میں انہوں نے چشمہ شعور کی تکنیک برتی ہے۔ جان محمد آزاد کے ناول بے پناہ دلچسپی کے حامل ہیں۔ کشمیر جاگ اٹھا، وادیاں بلارہی ہیں اور برفیلے لمحوں کا جنگل، ان کے تین طبع زاد ناول ہیں۔ آزاد، کرشن چندر کے اسلوب سے بے حد متاثر ہیں۔ انہیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنے ہی اردگرد کے ماحول سے اپنی کہانی کا تانا بانا اخذ کرتے ہیں اور پھر اپنے ناول میں ایسے پیوست کرتے ہیں کہ ایک حقیقی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ ان کے تینوں ناولوں کے نام علامتی ہیں اور کشمیر کے سرسبز و شاداب وادیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ کشمیر سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اسی لئے ان کے ناولوں میں کشمیر کا کلچر تہذیب اور تمدن کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی، آزاد کے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "جان محمد آزاد کا اسلوب شاعرانہ ہے۔ اس میں اگرچہ کرشن چندر کے اسلوب کی چھاپ ہے اور کہیں کہیں اسراف الفاظ نے خواہ مخواہ کی طوالت پیدا کی ہے۔ لیکن پس منظر کی فن کارانہ پیش کش یقیناً قابل داد ہے۔ بعض ٹکڑے قابل رشک حد تک خوبصورت ہیں۔ جان محمد آزاد جذباتی کیفیات اور نفسیاتی ہیجانات کی تصور پرکشی پر قدرت رکھتے ہیں اور بعض نازک مرحلوں

پر وہ کامیابی سے اپنی اس خصوصیت کو منواتے ہیں۔(۱)

'وادیا بلا رہی ہیں'' جان محمد آزاد کا اوّلین ناول ہے۔ جو ۱۹۸۰ء میں انہوں نے اپنے عزیز دوست عمر مجید کی مشاورت سے شائع کی۔ اس ناول میں وہ کشمیر کے نادیدہ مقامات کی سیر کراتے ہیں اور دلکش اور دل پذیر مناظر کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کہستانی علاقے میں لوگوں کی زندگی کی مشکلات کا جائزہ لیتے ہیں۔ آزاد نے یہ کہانی جذباتی انداز میں لکھی ہے اور بقول حامدی کاشمیری، اس میں تخیل آرائی، منظر نگاری، جذباتی کیفیات کی مصوری اور زبان وبیان کی حسن کاری بہ درجہ اُتم ملتی ہے۔

'برفیلے لمحوں کا جنگل' بھی آزاد کا قابل ذکر ناول ہے۔ جو ۱۹۹۵ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ ناول آج کل کے انسان کے درد کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ گھٹن، محرومی، تنہائی، بے راہ روی اور اجنبیت کے ملے جلے تاثرات اس ناول میں نظر آتے ہیں۔ جن کو آزاد کے قلم نے ایک نئے انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور بقول عمر مجید برف باری کی تیز ہواؤں میں غوطہ زن راتوں کے افسردہ شبستان پر چھائیوں کے شہر کی تنہائیاں۔ دیہاتی زندگی کے خمیر میں گندھے ہوئے وجود۔ ان کی مظلومیت اور گھٹن کی لرزاں خیز تصویریں۔ کبھی کبھی محسوس کرتا ہوں کہ وہ خود آنسو ہیں جو وقت کی آنکھ سے ٹپک کر صفحۂ قرطاس پر بکھر گیا ہے۔

ویدراہی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ڈوگری زبان کے ایک معتبر ادیب اور شاعر کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے ہندی اور اردو زبانوں کے توسط سے بھی نام کمایا ہے۔ اور کئی رنگا رنگ تصانیف شائع کر کے اپنی ادبی حیثیت مستحکم بنائی۔ وید جی ایک بہترین فلمساز اور ہدایت کار بھی ہیں۔ انہوں نے ڈوگری شاعر کی حیثیت سے بھی اپنا ایک قابل قدر مقام بنایا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں انہیں ڈوگری کہانیوں کے مجموعے 'آلے' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اندھی سرنگ، کے نام سے ان کا ایک ناول ۲۰۰۵ء میں شائع

(۱) مباحث: ڈاکٹر برج پریمی ص ۱۷۲

ہوا جوان کے ذاتی تجربات اور محرکات کا غماز ہے۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار بمبئی کی فضاؤں میں رہ کر بھی اپنے مادر وطن کو یاد کرتے ہیں۔ انہیں اپنے بچپن کے بے فکر لمحات یاد آتے ہیں۔ وہ ان گلیوں، سڑکوں اور جگہوں کو یاد کرتے ہیں جہاں اُنہوں نے اپنی زندگی کے بہترین پل گذارے ہیں۔ وہ متوسط طبقہ کے لوگوں کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ ان کے دکھوں اور مایوسیوں کو دور کرنے کی وہ حد درجہ کوشش کرتے ہیں۔ ''اندھی سرنگ'' سماج میں پھیلی ہوئی بد دیانتی کو قلع قمع کرنے کا شدید احساس دلاتا ہے۔ یہ ایک طنزیہ ناول ہے۔ جس میں مختلف کرداروں کے ذریعے سے زندگی کے حقائق کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ناول، بے حد دلچسپ ہے اور اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔

عبدالغنی شیخ دُنیا کے بلند ترین مقام لیہہ لداخ میں پیدا ہوئے۔ وہ بیک وقت ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی، سوانح نویس بھی اور محقق بھی، ''وہ زمانہ''، ان کے لداخ کے ماحول اور اس کے تہذیب اور کلچر پر ایک تاریخی ناول ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''دِل ہی تو ہے''۔ جو ۱۹۷۸ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو لداخ کی ایک دوشیزہ کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔ لیکن پھر جب ان کی محبت کے درمیان ایک اور کردار آتا ہے تو یہ کہانی نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ شیخ کا ناول ''دل ہی تو ہے'' سونم اور پدماں کی محبت کی داستان ہے انہوں نے اس محبت کو خالص لداخ کے پس منظر میں پیش کیا ہے اور کامیابی سے زینہ بہ زینہ طے کر کے اس داستان کو ایک ایسے موڑ پر لایا جہاں خود بخود تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل سماج کا ٹکراؤ اور تضاد ہے۔ اس میں سیماں کا کردار داخل ہونے سے کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیہہ کے ماحول اور یورپی سیاحوں کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ایک دلچسپ رومانی ناول ہے۔

آنند لہر ایک اور کہانی کار ہیں۔ جنہوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے ناول بھی لکھے جو سنجیدہ ادبی حلقوں میں خاصے بحث کا موضوع بن چکے ہیں۔ ''اگلی عید سے پہلے''

سرحدوں کے بیچ اور مجھ سے کہا ہوتا ان کے بعض کامیاب ناول ہیں۔ مجھ سے کہا ہوتا ان کا تازہ ترین ناول ہے۔ جس میں انہوں نے ایک نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ناول میں کوئی انسانی کردار نظر نہیں آتا ہے بلکہ ناول نگار نے جانوروں اور پرندوں کی گفتگو سے انسانی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

آنند ایک حساس فنکار ہیں۔ وہ دراصل عراق اور امریکہ کی جنگ سے ہونے والی تباہ کاری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی لئے انسانیت کا خون، فاقہ کشی، قحط سالی کے ساتھ ساتھ ملکوں کا آپسی تناؤ اور ٹکراؤ، طاقتور بننے کے لئے غریب اور پسماندہ قوموں کا استحصال اور اٹیم بموں اور ہائیڈروجن بموں کے استعمال سے دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل، قدرتی وسائل کی کمی، ماحول کی آلودگی اور کئی ایسے سوالات ناول مجھ سے کہا ہوتا میں ابھرتے ہیں۔ یہ تمام سوالات نہ صرف ایک انسان سے جواب طلب کرتے ہیں بلکہ عام انسانیت پر چوٹ بھی کرتے ہیں۔ آنند لہر نے ان مسائل کو پہلی بار محسوس کیا ہے اور اپنے ناول میں طنزیہ لب ولہجے میں ان تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے دوسرے ناولوں میں بھی یہی طنزیہ لب ولہجہ ملتا ہے۔ ''اگلی عید سے پہلے'' اور سرحدوں کے بیچ آنند کی زندگی کے دو اہم پڑاؤ ہیں۔ جن میں وہ انسان کو انسان ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ جنگ وجدل، قتل، غارت اور ملکی فساد کے خلاف ہیں۔ سرحد ان کے فن کی ایک خاص علامت ہے۔ اس علامت کے ذریعے سے وہ امن بھائی چارہ محبت اور خلوص کا جذبہ عام کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق ملکوں کی تقسیم ایک فرضی قصہ ہے۔ جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ انسانیت، عالمی برادری، اخوت اور بھائی چارے کے لئے دعا کرتے ہیں اور اپنے ناولوں میں امن اور شانتی کی اپیل کرتے ہیں۔

جدید خواتین ناول نگاروں میں ترنم ریاض کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ افسانہ نگاری کی طرف مایل ہیں اور شعر وشاعری میں اپنے فکر کی گہرائی اور جذبے کی شدت سے ایک قابل قدر مقام بنا چکی ہیں۔ لیکن بحیثیت ایک ناول نگار کے بھی وہ علمی وادبی دُنیا میں

اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔ ان کا ناول ''مورتی'' اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتا ہے۔ اس ناول میں ناول نگار خواتین کے مسائل ابھارنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ ترنم ریاض اپنے ناول میں کشمیر کے دلدوز حالات یہاں کی معاشی اور سیاسی زندگی اور یہاں کی غربت وافلاس کا نقشہ کھینچنے میں پیش پیش ہیں۔ ''مورتی'' میں سماجی بدعتوں اور سیاسی ہتھکڑوں پر بھی کہیں کہیں طنز ملتا ہے۔ ترنم ریاض نے ۱۹۹۰ء کے دوران کشمیر کی تباہ کاریوں کی تصویر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ بندوق کے نوک پر بے بس اور لاچار عوام پر ہوئے ظلم وتشدد کی عین گواہ ہیں اور کشمیر سے لاکھوں کی تعداد میں ہجرت کرنے والے لوگوں کی بے بسی خاص طور پر ملتی ہے۔ ترنم ریاض نے ہمیشہ عوام کے دکھ درد کا اپنے قلم سے مداوا کیا ہے۔ اُن کا قلم ہمیشہ ظالم اور جابروں پر طنز کے تیر برساتا رہا۔ اُن کا ناول مورتی ان تمام چیزوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ عمر مجید کا نام شبنم قیوم اور ڈی کے کنول کے ساتھ اُبھرا۔ ان کے دو ناول یہ بستی یہ لوگ ۱۹۷۰ء اور درد کا دریا ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئے اور خاص وعام میں مقبول ہوئے عمر مجید کہانی کہنے کا گر جانتے ہیں۔ وہ کرشن چندر کے فن سے بے حد متاثر ہیں۔ مقامی کہانی کاروں میں وہ برج پریمی پشکر ناتھ اور نور شاہ کو پسند کرتے ہیں اور ان کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ عمر مجید کے محبوب موضوعات بھوک، افلاس، سماج نابرابری، غربت اور ناداری ہے وہ اپنے ناولوں میں طنزیہ پرایہ بھی اختیار کرتے ہیں اور ان کے ہاں رومانیت بھی ملتی ہیں جو انکے ناول کو سدا بہار بناتی ہے۔

فاروق رینزو دور جدید کے ایک باصلاحیت ناول نگار ہیں۔ ان کا اوّلین ناول زخموں کی سالگرہ ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول طلبہ کی بے چینی اور اضطراب پیش کرتا ہے اور نوجوان نسل کو اپنے فرائض کا احساس دلاتا ہے۔

سجاد حسین بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔ وہ سرزمین کشمیر کے ایک ایسے ناول نگار ہیں۔ جن کا قلم ہر دم جھوٹ، مکروفریب اور ظلم وتشدد کے خلاف لڑتا رہا ان کا اوّلین ناول اُڑان، کے نام سے شائع ہوا اس ناول کے مقبول ہونے سے ان کا حوصلہ بڑھ

گیا اورانہوں نے اس سلسلے کو برقرار رکھا۔ پنجے، دامن کے تار، سایہ، ننگی ان کے بعض قابل مطالعہ ناول ہیں۔ ان کے یہ ناول اپنے گردوپیش کے مسائل کو ابھارتے ہیں۔ دوسرے ناول نگاروں میں اشوک کول، پشوری لال شرر، رفیق اشبری، مشتاق مہدی، رشید پروین وغیرہ جیسے ناول نگاروں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے بزرگ ناول نگاروں کا سفر آگے بڑھایا۔ چنانچہ مشتاق مہدی کا ناول ''دل کا دھواں'' رشید پروین کے دو ناول ''دل اور درد'' ۱۹۷۲ء میں اور پیاسی پائل ۱۹۷۵ء میں عمر فرحت کا ناول ''نراکار'' ۲۰۱۱ء میں رفیق اشبری کا ناول، اور پتھر پگھل گئے ۱۹۷۵ء میں اشوک کول کا ناول میری روٹی کہاں ہے؟ اور پشوری لال شرر کا ناول سسکتا سماج ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ ان ناول نگاروں کے علاوہ بعض اور ناول نگار ہیں جنہوں نے کئی ناول لکھے ہیں لیکن تادم تحریر یہ ناول منظر عام پر نہیں آئے۔ ان ناولوں میں نور شاہ کا ناول ''برف اور سناٹے، پرویز مانوس کا ناول فریاد اور عمر مجید کا ناول زیتون کے نام لئے سکتے ہیں۔ ان ناولوں کو بھی عنقریب ہی شائع کر کے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ اس طرح سے معلوم ہوتا ہے اردو ناول کا سفر بھی اُردو کے دوسری نثری اصناف کی طرح جاری ہے اور ناول نگار بڑی سرگرمی کے ساتھ اس فن کی آبیاری کررہے ہیں۔

●●●

تبصرے

سمندر سوچتا ہے

رئیس الدین رئیس دورِ حاضر کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ''سمندر سوچتا ہے'' اُن کا تازہ شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۷ء میں منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اس سے پہلے آسمان حیران ہے (۱۹۹۰ء) اور زمین خاموش ہے (۲۰۰۱ء) میں اُن کے دو شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں، جن کی علمی و ادبی دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔ ''سمندر سوچتا ہے'' میں رئیس کا صحت مند کلام ملتا ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس مجموعے میں چند ایک رباعیات اور قطعات آٹے میں نمک کے برابر ملتے ہیں لیکن اصل میں وہ غزل کے مردِ میدان ہیں اور غزل میں ہی اُن کی انفرادیت جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رئیس قدیم اُردو اور فارسی روایات سے واقفیت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نئی اردو شاعری سے بھی

انہیں خاص لگاؤ ہے۔اس لئے ان کی شاعری میں قدیم اور جدید جذبات وتجربات کا سنگم بہ درجہ اتم ملتا ہے۔خود ایک جگہ اس بات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''قدیم اُردو فارسی شاعری کا میں دلدادہ رہا ہوں جس نے میرے ذہن کی تربیت کی لیکن جب میری شعر گوئی کا آغاز ہوا تو جدید شاعری کے خدو خال روشن ہو چکے تھے۔ مجھے یہ اسالیب پسند آئے اور میں نے اس راہ پر اپنے اشہب فکرو قلم کو رواں کیا۔ اس طرح جو کچھ وجود میں آیا ہے یا آرہا ہے۔اس میں نئی غزل کی تراش وخراش موجود ہے۔''

رئیس الدین رئیس، اسعد بدایوانی، احمد وصی، کرشن کمار طور، پروین کمار اشک، شہپر رسول، شکیب جلالی، عزیز اندوری، عبدالاحد ساز، ابراہیم اشک، مظفر ایرج پرتپال سنگھ بیتاب اور سیفی سرونجی کے کارواں سے تعلق رکھتے ہیں۔میر، غالب، انیس، اقبال اور فیض ان کے پسندیدہ شعراء میں سے ہیں۔لیکن علامہ ماجد الباقری، گلزار دہلوی، ظہیر غازی پوری، مظفر حنفی، شہریار، فضا ابن فیضی، کرشن موہن، کالی داس گپتا رضا، بیکل اُتساہی، شباب للت اور زبیر رضوی کے کلام کے مطالعے نے ان کے ذہن کے دروازے وا کئے، اسی لئے ان کی غزلوں میں تڑپ اور گداختگی پیدا ہوگئی۔

رئیس الدین رئیس، علی گڑھ میں پلے، بڑھے اور جوان ہوئے۔اس لئے علی گڑھ کی شاندار روایت ان کے رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔اردو کے معروف شاعر جمنا پرشاد راہی نے اُن کا ہاتھ تھام لیا، اس طرح سے ان کا سفر اور بھی آسان بن گیا۔آخر وہ شعر وادب کے گلستان کا میلوں فاصلہ طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں انہیں کہنا پڑا۔

میں قطرہ ہوں مگر وسعت پہ میری
یہ دریا کیا سمندر سوچتا ہے

اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں رئیس کا اپنی شاعری سے کما حقہ واقفیت رکھتے

ہیں وہاں عصری اردو شاعری کا بھی گہرا ادراک رکھتے ہیں ۔علامہ ماجد الباقری اور ظہیر غازی پوری کی حوصلہ افزائی سے وہ شعروادب کے میدان میں پیش قدمی کرتے رہے اور ان کا نام عصر حاضر کے شعراء میں نمایاں طور لیا جانے لگا۔

رئیس الدین رئیس کو غزل سے فطری لگاؤ ہے اور اس صنف میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔غزل کے بارے میں ان کا نظریہ واضح اور صاف ہے، کہتے ہیں:

میری غزل شایانِ قبول
کیسا ہے خود سے ہی مذاق

رئیس الدین رئیس کی غزل میں جہاں حسن وعشق کی تب وتاب ملتی ہے وہاں اس میں حیات وکائنات کے مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ان کے ہاں عصر حاضر کے انسان کا درد وکرب بھی شدومد کے ساتھ ابھرتا ہے اور وہ ذاتی مسائل اور الجھنوں اور اپنی نجی پریشانیوں کا بھی دل کھول کر احاطہ کرتے ہیں۔وہ ایک حقیقی شاعر ہیں اور سچے دل سے شعر کہتے ہیں۔وہ اپنے انوکھے جذبات واحساسات کو موثر الفاظ میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔سمندر سوچتا ہے، میں سے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔جن میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور فن کی نزاکتوں کا بھرپور احساس بھی،مثلاً:۔

دریا پہ کوئی پیاس کا پیکر نہیں دیکھا
کیا تم نے کبھی گھاٹ کا پتھر نہیں دیکھا

آنے لگی ہیں گاؤں کے منظر کے آس پاس
اُس بے لباس شہر کے قدموں کی آہٹیں

میں قطرہ ہوں یوں تو خود میں سمٹا رہتا ہوں
لیکن ایک سمندر جیسی وسعت رکھتا ہوں

میرے رستے میں دریا دشت اور کہسار رکھ کر
سہولت کی جگہ مجھ کو مسائل دے گیا ہے

تم اپنی پیاس کو رہنے دو محو خواب یونہی
کہ بحر بحر ابھی تو سراب جاگتے بھی

رومانیت اور ماورائی احساس رئیسؔ کی غزلوں کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ اس احساس نے اُن کی غزلوں میں سوچ وفکر کے نئے دفتر کھول دیئے ہیں۔ رئیس سادہ اور سلیس زبان میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ وہ سچ اور کھرے فنکار ہیں، وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں محسوس کر کے لکھتے ہیں۔ اُن میں خوداعتمادی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری فکروفن کی نئی سرحدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں اپنی ذات کو ملوث کر کے کائنات کے تمام انسانوں کی بات کرتے ہیں اور جذبۂ انسانیت کو تقویت دینے کا درس دیتے ہیں۔ ''میں''، ''مجھ'' اور ''میرے'' رئیس کی شاعری میں نمائندہ علائم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہی علائم سے وہ کائنات کی تسخیر کرنے کا درس دیتے ہیں۔ وہ اچھے اور موثر طریقے سے اپنی بات پڑھنے والوں تک پہنچا دیتے ہیں: مثلاً

ابر دے اور نہ دریا نہ شجر دے مجھ کو
حوصلہ دشت نوردی کا اگر دے مجھ کو

رگوں میں دوڑتا میٹھا سا زہر بولتا ہے
مرے وجود میں ہر لحہ شہر بولتا ہے

نہ شب میری ، نہ صبح وشام میرے
مکاں کس نے لکھا ہے نام میرے

میں تاثر لیے لوٹا ہوں سفر سے کیا کیا
زخم ہنستے ہوئے گزرے میں نظر سے کیا کیا
میں چاہتا تھا مرے بال و پر نکل آئیں
دعا قبول ہوئی بھی مگر خزاں میں ہوئی

مری ہی کرب رتوں نے کیا شکار مجھے
بہا کے لے گیا اشکوں کا آبشار مجھے

رئیس نے اپنی بات منوانے کے لئے گھر گھر ڈھنڈورا نہیں پیٹا اور نہ ڈرامابازی سے کام لیا ہے بلکہ وہ آہستہ سے قدم آگے بڑھاتے گئے اور خاموشی سے اپنی منزل سر کرتے گئے۔اسی لئے ان کے اسلوب میں تازگی وتوانائی پائی جاتی ہے۔ان سے دور حاضر میں ہو رہی بدعنوانی نہیں دیکھی جاتی ہے، جہاں انسان انسان کے خون کا پیاسا ہے۔یہاں ان کا لہجہ طنزیہ بن جاتا ہے اور وہ اس ماحول، سوسائٹی اور انسان پر طنز کرنے لگتے ہیں اور حق وصداقت کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔دیکھئے کیسے اپنے قلم کو زبان دیتے ہیں:۔

گذشتہ موسم باراں کی یاد میں شاید
ہماری چھت پہ ابھی زرد گھاس باقی ہے

بولیاں لگتی ہوئی دیکھی گئیں اسناد کی
اور فن بازار میں بکتا ہوا دیکھا گیا

میں اپنے آپ کو منسوب کیوں کروں تجھ سے
کہ میرے ساتھ بھی نام ونسب نہیں ہے کیا

محبتوں کے ورق پہ لکھی ہیں نفرتیں اُف
چھپی ہیں اخلاص میں عجب سی رقابتیں اُف

ناخوشگوار ہند پاک تعلقات سے پیدا ہونے والی صورتحال، دور حاضر کا سب سے اہم اور فکر انگیز موضوع بن گیا ہے۔ دہشت گردی نے ہمارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ روز معصوم انسانوں کا خون ہوتا ہے۔ بم دھماکوں سے ہماری معیشت تباہ ہوگئی ہے۔ وطن میں بے وطنی کا تصور ابھرتا ہے۔ رئیس ان تمام چیزوں کو ایک حساس فنکار کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ وہ اُن لیڈروں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں جنہوں نے ملک میں ایسے حالات پیدا کئے ہیں۔ اُن کی یہ غزل توجہ طلب ہے، کہتے ہیں:۔

خوں رنگ ہرا باغ یہاں بھی وہاں بھی ہے
ہر سینہ داغ داغ یہاں بھی وہاں بھی ہے

اُمید کا چراغ یہاں بھی وہاں بھی ہے
ہرگام سبز باغ یہاں بھی وہاں بھی ہے

ہر دیش کے گلوں میں بھی یکساں ہیں رنگ وبو
یعنی تراسراغ یہاں بھی وہاں بھی ہے

دولت کا ہو خمار کہ رتبے کا حسن کا
نشے میں ہر دماغ یہاں بھی وہاں بھی ہے

کس کی رئیس راہ نمائی کرے قبول
رہبر تو بددماغ یہاں بھی وہاں بھی ہے

رئیس الدین رئیس کی زبان نرم اور سبک ہے۔ اس میں روانی بھی ہے اور سادگی بھی۔ وہ خوشنما تشبیہات واستعارات کا استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اُن کے علایم سے بے شمار پیکر اُبھرتے ہیں جو شعر میں ایک خاص قسم کی لطافت پیدا کرتے ہیں۔ ''سمندر سوچتا ہے''۔ رئیس الدین رئیس کا خوبصورت شعری مجموعہ ہے۔ جو توجہ طلب ہے۔ ۲۰۰۷ء میں یہ مجموعہ اے پی آفسٹ پرنٹنگ پریس، نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ فخر الشعراء حضرت شاہد احسن مراد آبادی نے بڑے سلیقے سے اس شعری مجموعے کو ترتیب دیا ہے اور رئیس کی غزلوں کا انتخاب عمدگی سے کیا ہے۔ ''سمندر سوچتا ہے'' کا سرورق دیدہ زیب ہے اور یہ شعیرہ فرحین کی فکر کا نتیجہ ہے۔ میں رئیس الدین رئیس کی اس شعری کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

●●●

دعا زمین

پروین کمار اشک اُن ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کو ایک نیا لہجہ عطا کیا اور اس میں نئے گل بوٹے کھلائے۔ وہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت کم لکھتے ہیں لیکن جو بھی لکھتے ہیں اُس میں وزن اور وقار ہوتا ہے۔ چاندنی کے خطوط اور غزل تیرے شہر میں، کے بعد ''دعا زمیں'' اشک کی تازہ غزلوں پر مشتمل ایک خوبصورت شعری مجموعہ ہے۔ جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ اس شعری مجموعے میں ۷۴ غزلیں اور چند متفرق اشعار شامل ہیں جو اُن کے گوناگوں تجربات پر محیط ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید، اشک کی غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

''اُردو غزل کو نئی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی دعوت دینے والے شاعروں میں پروین کمار اشک ممتاز مقام کے حقدار ہیں۔ ان کی غزل سے معنوی طور پر جو تثلیث ابھری ہے۔ وہ گھر، ماں اور بچے کی ہے۔ اس تثلیث سے پروین کمار اشک نے اپنا غزلیہ

تشخص اور اپنی پہچان قائم کی ہے اور اسی تثلیث سے لاشعوری طور پر اُس نے غزل کو نئی زمین دی ہے"

اشک جذبے کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں کوئی بناوٹ نہیں بلکہ وہ نہایت ہی احتیاط سے اپنے خیالات کاغذ پر انڈیلتے ہیں اور اپنی بات خوبصورت انداز میں قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔ اشک کی شاعری ایک پہاڑی ندی کی طرح مدھر سنگیت سناتی ہوئی رواں دواں ہے۔ اس میں من کو موہ لینے والی کیفیت موجود ہے، جو قاری کو دیر تک مسحور کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اپنے فکر و فن سے اس صنف سخن کو نیا انداز عطا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں معنی آفرینی بھی ہے اور حسن بیان بھی، تغزل بھی اور درد و کسک بھی۔ مثلاً۔

وہ پیش رو ہے مگر راستا نہیں دیتا ۔۔۔ بزرگ ہو کے بھی دیکھو دُعا نہیں دیتا
مجھے یہ کیسا سمندر صدائیں دیتا ہے ۔۔۔ جو مجھ کو ڈوبنے کا حوصلا نہیں دیتا
کسی کسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی ۔۔۔ خدا ہر ایک کو اپنا پتا نہیں دیتا

چاند بردار ہو گیا ہوں میں ۔۔۔ دیکھو! فنکار ہو گیا ہوں میں
تجھ کو سوچا ہے اس قدر میں نے ۔۔۔ تیرا کردار ہو گیا ہوں میں
میرے سب کار کر رہا ہے وہ ۔۔۔ کتنا بے کار ہو گیا ہوں میں
اس کمینے کی روٹیاں کھا کر ۔۔۔ سخت بیمار ہو گیا ہوں میں

دل کو پھول بنایا کر ۔۔۔ پھر درگاہ میں جایا کر
کوئی دُعا کا پیڑ لگا ۔۔۔ ننگے سروں پر سایا کر
تیری خیر اسی میں ہے ۔۔۔ سب کی خیر منایا کر

اشک ایک نئے لہجے کے باوقار شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں نئی غزل کی بازگشت

سنائی دیتی ہے۔ وہ نرم اور ملائم لہجے میں بات کہنے کے قائل ہیں جو دِلوں میں مسحور کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اُن کی غزلیں اپنے حسن اور نزاکت سے دلکش ودلگداز بھی ہیں اور کیف وسرمستی سے لبریز بھی۔ اُردو کے معروف شاعر ناصر شہزاد، دعا زمین کے سرنامے میں اشک کی غزل میں نئے لہجے اور حسن بیان کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''پروین کمار اشک ہندوستان کے اُن چند شعراء میں سے ایک ہے جنہوں نے ادھر اُردو غزل کے جمال کو روبہ زوال نہیں ہونے دیا۔ پروین کی غزل میں جدید انداز کی نئی نئی جہتیں اور نئی رہتیں ہیں۔ غزل میں وہ اپنی بات بڑی آسانی اور بڑی کامرانی سے صراط کرر ہے ہیں۔''

اس اقتباس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اشک ایک مقبول شاعر ہیں اور اس مقبولیت کا راز ان کے لہجے میں مضمر ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں ایک عجیب قسم کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً

تُو نے میری گاگر ریت سے بھر دی میرا دوش تھا کیا
میں تو پانی میں اترا تھا دریا تیرے کہنے پر
سوکھے باغوں پر ساون کے بادل چھا جاتے تھے اشک
جب ہم روتے تھے سر رکھ کر اک دوجے کے شانے پر

چاند بردار ہوگیا ہوں میں
دیکھو! فنکار ہوگیا ہوں میں
قبر میں گھر بنا لیا میں نے
ہاں! زمیں دار ہوگیا ہوں میں
میرے سب کار کر رہا ہے وہ
کتنا بے کار ہوگیا ہوں میں
پھول جب سے ہوئے ہیں قتل مرے
اشک تلوار ہوگیا ہوں میں
سوکھے کھیتوں سے کہہ دو پانی لے لیں
میری آنکھ سے دریا بہتا جاتا ہے
جہاں پرکھوں کے سجدوں کے نشاں ہیں
وہ گلیاں خون سے کیوں دھو رہے ہیں

اشک ایک حساس اور دردمند شاعر ہیں۔ اُنہوں نے غزل کو ایک نئے مزاج سے آشنا کیا۔ اُن کی غزل میں رنگ بھی ہے اور خوشبو بھی۔ اس رنگ اور خوشبو کے امتزاج سے اُن کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اشک کی زبان نرم اور ملائم ہے۔ یہی زبان کی نرماہٹ اور شیرینی ان کے فن کی کامیابی کی ضامن ہے۔ ساقی فاروقی نے اشک کی شاعری میں ندرت کا احساس دلاتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ اشک کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ وہ ان کی تازہ کاری اور زبان پر کنٹرول سے بے حد متاثر ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اشک نے زبان و بیان کی جادوگری سے اپنے فکر وخیال کو جو تازگی اور توانائی عطا کی ہے وہ ان کی غزل کے ہر ایک شعر میں عیاں ہے۔ ایک جگہ اس کا احساس یوں لاتے ہیں:۔

یا غزل مت اتارو کاغذ پر
یا کلیجہ نکال رکھا کرو

اس کا مطلب یہ ہے کہ غزل کے بارے میں ان کا نظریہ صاف اور واضح ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

میرے دل کے سفید کاغذ پر
ایک آنسو ہے تو غزل کی طرح

اشک غزل کو ایک معتبر اور باوقار صنف سخن قرار دیتے ہیں اور اس میں عصر حاضر میں ہونے والی بے ضابطگیاں برداشت نہیں کرتے۔ وہ خود بہترین غزل گو شاعر ہیں اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی برداشت کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

غزل مایوس ہوکر ہر جگہ سے
کھڑی ہے میرے در پر رو رہی ہے

پروین کمار اشک کی غزل میں وسعت بھی ہے اور فکر انگیزی بھی۔ اس میں ان کے اکثر موضوعات تجربات میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ بقول نثار احمد فاروقی، ان کی

غزل ایک مشکل غزل ہے۔اس کے لئے ایک وقیقہ رس دماغ، دردمند دِل اور جلتے ہوئے احساس کی ضرورت ہے جو ایک قلمکار کو آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ مرحلہ نازک بھی ہے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لئے محنتِ شائقہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثلاً

فلک خنجر زمین تلوار والی   مرا کوئی نہیں سرکار والی
تری بندوق کیا مارے گی مجھ کو   کہیں سے تیغ لاکردار والی

اشک کے موضوعات انسان دوستی، عالمی برادری، جذبۂ حب الوطنی اور امن و آشتی ہے۔ وہ خلوص دِل سے انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ اوراس کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے ہاں خلوص بھی پایا جاتا ہے اور جذبہ ایثار بھی، محبت کے اَن گنت رنگ بھی اور پیار کی خوشبو بھی وہ ان تمام چیزوں کو خلوص دِل سے آبیاری کرتے ہیں۔ اور اپنے جذبات کو عام فہم زبان اور سادہ اسلوب بیان سے قاری تک پہنچادینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہند پاک جھگڑے نے عالمی امن کو برباد کردیا ہے۔ آئے دن انسانیت سوز واقعات رونما ہوتے ہیں۔ سرحد کے آرپار زبردست تناؤ سے دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ نئے نئے جنگی حربے استعمال کئے جارہے ہیں۔ ان تمام حالات کا ایک عام انسان پر براہ راست اثر پڑ گیا ہے۔ سیاسی آقا اپنے مقاصد کیلئے نہ ختم ہونے والا خونین ڈراما کھیل رہے ہیں۔ دونوں ملکوں کے کروڑوں عوام گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں۔ انکا امن وسکون لٹ گیا ہے۔ اشک نے ان تمام واقعات کی عکاسی بڑے دلنشین انداز سے کی ہے۔ وہ کہیں کہیں ہلکے پھلکے اشاروں اور کنایوں سے اور کہیں کھل کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ آپسی برادری اخوت اور بھائی چارہ ہی دونوں ملکوں کی خوشحالی کی علامت ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

زمیں کو اے خدا وہ زلزلہ دے
نشان تک سرحدوں کے جو مٹادے
محبت میں بدل جائے سیاست
خدا لاہور دلی سے ملا دے

باغ انگور کے چھوڑ آیا تھا سرحد پار جوانی میں
پاگل بوڑھا پل پل کشمش کشمش کرتا رہتا ہے

مہاجر کا مکاں خالی ہے لیکن
میں در کھولوں تو کوئی بددعا دے

اشک کی غزلوں میں گیت کا رس ٹپکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ ملائم اور نرم ہندی کے الفاظ بھی استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ ان گیت نما غزلوں میں احساس کی شدت بھی ہے اور نغمگی بھی، درد و کرب بھی ہے اور عصری آگہی کا عرفان بھی۔ ان کی غزلوں میں دھرتی، تتلیاں، سرگم، ساگر، گاگر، ریت، گھنگرو، آکاش، ندی، پائل، ڈھولک، آنسو، پنچھی، مانجھی، ساجن، بادل وغیرہ جیسے الفاظ اپنے پورے آب و تاب سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور نئی علائم اور پیکروں کو جنم دیتے ہیں۔ اس ضمن میں اشک کی غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں مثلاً:۔

سوکھے موسم کا بین سنتے ہی — میگھ ملہار ہوگیا ہوں میں
بھوکا پیاسا زخمی پنچھی کب آپہنچے، کیا معلوم — سوکھ نہ جاوے انگوروں کی بیل خدایا رحم ذرا
دِل کو پھول بنایا کر — پھر درگاہ میں جایا کر
پانی نکلے پتھر سے — ایسا تیر چلایا کر
کوئی دعا کا پیڑ لگا — ننگے سروں پر سایا کر
تتلی ہاتھ نہ آئے گی — بچوں کو سمجھایا کر

ساون میں گھبرا جاتا ہے — دل میرا صحرا جاتا ہے
برف کا اک اک آنسو پی کر — دریا وجد میں آجاتا ہے
اصل سفر ہے وہاں سے آگے — جہاں تلک رستا جاتا ہے

پروین کمار اشک کی زبان سلیس اور رواں ہے۔اُن کے ہاں نئے نئے علائم اور پیکر ملتے ہیں ۔اُنہوں نے پرانی تشبیہات اور استعارات کو نئی زبان دے کر اپنی غزل کو نئے لہجے سے آشنا کیا۔اشک کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُنہیں مختصر بحور میں بات کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔اور یہی کیا کم اہم ہے۔

●●●

خوشبونما

ڈاکٹر صابر مرزا ریاست جموں وکشمیر کے شعراء کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو ۱۹۷۰ء کے بعد آسمانِ ادب پر طلوع ہوئی۔ وہ صوبہ جموں کے ایک دُور افتادہ مقام راجوری میں پیدا ہوئے۔ صابر بچپن سے ہی شعروادب کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں شہباز راجوروی، فاروق مضطر، پرتسپال سنگھ بے تاب، منشور بانہالی، تنویر بھدرواہی، پریمی رومانی، بے تاب جے پوری، وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ صابر نے اپنی فکر کی گہرائی اور خیالات کی پختگی سے اردو شعروادب میں اپنا نام پیدا کیا۔ وہ گوجری، پہاڑی اور پنجابی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان تمام زبانوں میں ان کی تخلیقات شائع ہوکر منظرعام پر آچکی ہیں۔ لیکن اردو زبان سے انہیں والہانہ عشق ہے اور یہ عشق انہیں علم وادب کی مختلف منزلوں کو سر کرنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔ وہ ایک حقیقی شاعر ہیں اور شعر کے توسط سے اپنے تجربات اور احساسات دوسروں تک پہنچانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

'خوشبونما' ڈاکٹر صابر مرزا کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی غزلیں بھی ملتی ہیں

اور نظمیں بھی۔ صابر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اُن کے خیالات میں تجربات کی بوقلمونی بھی ہے اور خیالات کی پاکیزگی بھی۔ خوش نما تراکیب بھی اور خوبصورت تشبیہات واستعارات بھی، منظر نگاری بھی اور ڈرامایت بھی اور یہ تمام خصوصیات ان کی غزل کو ایک نئی وسعت عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم، صابر کو شعری رفعتوں اور حقیقتوں کے شاعر تصور کرتے ہیں۔ حرفِ چند میں 'صابر کی غزلگوئی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''صابر کی شاعری کے بارے میں میرا پہلے سے ہی یہ تاثر تھا کہ وہ نہ تو تک بندی اور نہ ردیف وقافیہ کے شاعر ہیں بلکہ وہ شعری رفعتوں اور حقیقتوں سے پوری طرح بہرہ مند ہیں اور اب جبکہ ان کا شعری مجموعہ میرے پیش نظر ہے تو میں بڑی خوش گمانی اور وثوق سے فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ صابر مرزا کی شاعری اپنے اندر نہ صرف شعری محاسن سمیٹتے ہے بلکہ شعری تناظر میں ہمہ جہتی اور ہمہ رنگی کی آئینہ دار بھی ہے۔''

صابر مرزا بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل جو شاعر کی درون بینی ہے اور بقول یوسف حسن خان، اس میں زبردست تخلیقی قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ شاعر کو اپنے اندر جو عالم نظر آتا ہے وہ خارجی عالم کی رنگارنگی سے زیادہ دلکش اور حسین ہوتا ہے۔ اس کو سرو سمن کی سیر کی حاحت نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ اس کے دِل کی طلسمی دُنیا میں یہ سب کچھ تخیل وجذبے کے فیض سے پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو صابر کی غزل میں تخیل کی بلند پروازی بھی ہے اور جذبے کی شدت بھی، احساس کی نرمی بھی اور رنگ اور خوشبو بھی۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے اور غور کیجئے۔

اُگا کے رکھتا ہے مٹی میں کیسے کیسے نقوش
جسے وہ چاہے تو عکس جمیل دیتا ہے

بظاہر یہ ایک سادہ شعر ہے لیکن اس میں شاعر نے کتنی گہری بات کہی ہے اور زندگی کی

حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی سے مٹی میں سے عکس جمیل پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب ان کے ایک اور شعر پر غور کیجئے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ صابر کلاسیکی شاعری کے ساتھ ساتھ شعروادب کے نئے مزاج سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ شاعر انسان کی نفسیات اور اس کے درد و کرب کا شدید ادراک رکھتے ہیں ایک جگہ اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں:۔

آندھیوں کی گرم رفتاری کا تھا منظر تمام
ورنہ پیڑوں کے یہ پتے اتنے لرزیدہ نہ تھے

صابر ایک حقیقت پسند فنکار ہیں۔ ان کی شاعری میں دُنیا کی سچائی کا پردہ فاش ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ہر ایک کا احترام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اُنہیں ایسے انسان سے نفرت ہے جو مذہب کے نام پر انسانیت کا بٹوارہ کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں اس بات کی وضاحت نہایت ہی بلیغ انداز میں کی ہے۔ وہ کہیں صاف اور بلا کسی جھجک کے اور کہیں مختلف علائم سے کام لے کر اپنے کلیئے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

اب کہ ہے آزاد بالکل ہی سیاست کا وجود
اب تو رہزن بن کے ہی ہر ایک رہبر آئے گا

ہر طرف شب خوں حوادث وارداتوں کا نزول
راہزن بستی کے سارے راہبر ہونے لگے

ہوگئیں صابر ہوا س وقت کی جب تُند وتیز
جب ہی سارے پھول پتے منتشر ہونے لگے

مسئلہ یہ ہے کہ صابر آج تک بھی مُطلقاً
گھر میں رہ کر بھی میں اپنا گھر نہ دیکھوں چپ رہو

سورج ہے سسکیوں کی سیاہ کالکوں میں گم
سب گل زمیں پہ خون کی دلدل دکھائی دے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد جدید غزل کے محاسن پر بات کرتے ہوئے خوشبونما کے سرنامے میں صابر کی غزل کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"جدید غزل کے محاسن کا انحصار موضوعات کی کمی بیشی پر نہیں بلکہ جدیدیت پر ہے اور صابر مرزا کی غزل جدیدیت کی پوری طرح سے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔"

صابر کی غزل میں گیت کی لوچ ملتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کو اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا جامہ پہنا کر حرکت وحرارت بخشتے ہیں۔ اس طرح کی گیت نما غزلیں ان کے شعری مجموعے خوشبونما میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان غزلوں میں خیالات کی پختگی، فنکارانہ چابکدستی، زبان وبیان کی سادگی جگہ جگہ عیاں ہے۔ ان کی غزل کا مطلع دیکھئے:۔

پیپل کے اس پیڑ پہ کوئل آج بھی بولی ساری رات
میری آس کے پھول کی پتی شاخ پہ ڈولی ساری رات

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے:

ساری رات چمکتے دیکھا چاند اُفق کے شانے پر
اپنے آپ سے تاروں نے کی آنکھ مچولی ساری رات

صابر کی اس طرح کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ صابر جہاں، میر، غالب، اقبال، جوش اور جگر کا مطالعہ کر چکے ہیں وہاں وہ جمیل شفائی، جاں نثار اختر، ابن انشاء، شکیل

بدایونی اور ناصر کاظمی کی شاعری سے بھی گہرے طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے ہاں لطیف احساس جذبے کی شدت اور کیف وسر مستی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا لہجہ نرم اور ملائم ہے۔ وہ اپنے تجربے کو فکروفن کی بھٹی میں تپا کر کندن بناتے ہیں اور پھر صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں۔ یہی ان کی غزل گوئی کی خاص خصوصیت ہے۔

صابر مرزا اگر چہ غزل کے شاعر ہیں لیکن خوشبو نما کا آغاز ان کی نظموں سے ہوتا ہے۔ نظم ''خدا'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ خدا کائنات کی ہر شے میں موجود ہے۔ وہ رنگ بھی ہے اور خوشبو بھی شب کی تاریکی میں بھی وہ جلوہ نما ہے اور اُجالے میں بھی وہ کائنات کے ذرے ذرے کو منور کرتا ہے اور ہر ایک بھٹکے ہوئے انسان کو راہ دِکھاتا ہے۔ حمد باری تعالیٰ نعت سرور کونین، سرتاج اولیاء اور نذر حضرت بابا رسول شاہ بھی ایسی ہی تخلیقات ہیں۔ جن میں شاعر کائنات کے خالق سے اپنے والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ رب العالین کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اسی لئے وہ کبھی اس کی ذات پاک کو جہاں کا خالق قرار دیتے ہیں اور کبھی اُس کو سارے عالم کے مالک اور رزاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہیں قرآن کی آیات میں جلوہ نما پاتے ہیں اور کبھی انہیں لاوجودی قرار دے کر ان کو بلند و بالا مقام عطا کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

جس کا جلوہ ہے ارض وسماوات میں
وہ ہویدا ہے قطرات وزرات میں
مدام جلتے ہیں جس کو وحدتوں کے چراغ
مدام اس کی ہے مدح وثنا الاہو
سارے عالم کا مالک ہے رزاق ہے
جس کی قدرت نمایاں ہے حاجات میں
کیوں نہ ہو عالم بالا میں ترا اعلیٰ مقام
تم پہ اُترا ہے قرآن مدینے والے

خوشبو نما میں صوفیائے کرام کے نام سے ایک ایسی نظم ملتی ہے۔ جو شاعر نے اپنی دوسری بیٹی کے داغِ مفارقت دینے پر کہی ہے۔ یہ نا قابل برداشت غم اُنہیں زندگی کے ہر نازک اور پیچیدہ پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ بچی کی جدائی نے ان سے ہر خوشی چھین لی ہے۔ وہ آس لگائے بیٹھے ہیں اور نادیدہ دنیاؤں کی سیر کرتے ہیں۔ دیکھئے کس طرح اپنے جذبات کو زبان دیتے ہیں۔

گھر آنگن کو فرحت دینے
گھر میں آتے جاتے رہنا
ہو جائیں خوش رنگ فضائیں
تتلی روز اڑاتے رہنا
بوڑھی آنکھ میں میں لو بھرلوں
آس کا دیپ جلائے رہنا

صابر کی یہ دل خراش نظم اندر ہی اندر انقلاب پیدا کرتی ہے اور زندگی کے حقائق کی پوری تصویر سامنے لاتی ہے۔

''خوشبو نما'' میں جدید غزل کے عنوان کے تحت پانچ ایسی غزلیں ملتی ہیں جو آزاد غزل کے فارم سے ملتی جلتی ہیں۔ اس بات میں شک نہیں کہ آزاد غزل کا پہلا پتھر مظہر امام نے رکھا۔ یہ اس زمانے میں ایک نیا تجربہ تھا جو آہستہ آہستہ سے مقبولیت کی سند حاصل کر گیا۔ اس کے بعد مختلف شعرا نے مختلف تجربے کئے۔ آج کل انٹی غزل۔ غزل نما، روایتی غزل اور معریٰ غزل کے فارم میں شعرا اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان تمام غزلوں کا خمیر آزاد غزل ہی تو ہے۔ جدید غزل بھی صابر مرزا کی ایسی ہی کوشش ہے، جس میں تجربے کی وسعت بھی ہے اور فکر و خیال کی گہرائی و گیرائی بھی۔ ان کی اس طرح کی غزلوں میں وادیٔ کشمیر کی خنک ہوائیں رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ کانگڑی، چنار، برف، گلاب، نسیم، صبا، سرو صنوبر، زرد پیڑ، شبنم وغیرہ بے شمار علائم ملتے ہیں جن سے آنکھوں

کوفرحت اور روح کوتازگی ملتی ہے۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے:۔

ے بھرے جبھی اس نے کانگڑی میں سب چناروں کے گیلے پتے
ہوائیں بر فیلے موسموں کی ستارہی تھیں۔

ے چنار، سروصنوبروں کی جڑیں تو صدیوں سے کٹ چکی تھیں
گلوں کو احساس ہو چکا تھا۔

ے گلاب موسم کے آئینوں کا رنگ سارا خلاؤں میں ہے
بچھڑ کے مجھ سے آلاؤں میں ہے۔

''خوشبونما'' صابر مرزا کا قابل قدر شعری مجموعہ ہے جو اپنی لطافت، شعری نزاکت، کیف وسرمستی اور حسن وجمال کا مرقع ہے۔ اس شعری کاوش کا مطالعہ ہر سنجیدہ قاری کے لئے ضروری ہے۔

●●●

قانوسِ قلب

شاذ شرقی کا نام نئے شعراء کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ قانوس قلب اُن کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے۔ جو اُن کی ۶۰ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ حسن و عشق، غم و الم، انسان کے درد و کرب کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کے آشوب کا مرقع پیش کرتا ہے اور اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا ہے۔

شاذؔ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُن کا نعتیہ کلام بھی کتابی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ انہوں نے نظم بریں کے نام سے اپنے والد مرحوم کا شعری مجموعہ بھی چند سال قبل زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ وہ ارضیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ابھی چند سال قبل حسن وظیفہ یار ہو گئے ہیں اور اس طرح سے انہوں نے زندگی کے مختلف محاذوں پر اپنی محنت لگن اور صلاحیت سے اپنا جھنڈا اگاڑ دیا ہے۔

شاذ اگر چہ حسن و عشق کی رنگا رنگی کو اپنا محبوب موضوع بنا چکے ہیں۔ لیکن واردات قلب، انسان کا درد و کرب، عصر حاضر کے پیچ در پیچ زندگی کے مسائل اور پامال انسانی حقوق کی بحالی

کا جذبہ ان کی شاعری میں پورے شدومد کے ساتھ ابھرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کو صحیح سمت عطا کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اُن کے ہاں جہاں حسن کی قدر و قیمت ہے وہاں وہ عشق کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ حسن و عشق کی ہی ملی جلی کیفیت ان کی غزلوں کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق صداقت اور سچائی کا پیکر ہے۔ اور حسن پاکیزگی کی علامت۔ وہ ان دونوں جذبوں کو دل کی عمیق گہرائیوں سے قدر کرتے ہیں اور اپنے دل کے درد کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

عشق کی جب آگ بھڑکے وہ تڑپ اُٹھیں گے شاذ
کون کہتا ہے کہ وہ آئیں گے سر کے بل نہیں

سمندر عشق ہے ساحل کوئی جس کا لہو نہیں ہوتا
یہاں سے پار اکثر کرلی بھی بیڑا نہیں ہوتا

کیا محبت ہے حماقت ، عشق کوئی گناہ
کردیا ہے گر تو کیا میری خطا ہے دوستو

عشق تم کہتے ہو دردِ لادوا ہے دوستو
کیوں بھلا بھر درد یہ راحت فزا ہے دوستو

شاذ کی شاعری میں زندگی کے تلخ حقائق سامنے آتے ہیں۔ وہ زندگی کو ہر زاویۂ نگاہ سے پرکھنے اور برتنے کے قائل ہیں۔ لہٰذا انسانی زندگی کے بے کراں تجربات ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ وہ کبھی زندگی سے شکوہ کرنے لگتے ہیں کبھی اس کا سواگت سچے دل سے کرتے ہیں۔ اُن کے لئے زندگی ایک ایسی دولت ہے۔ جو محض عیش پرستی ہی نہیں بلکہ

مصائب و مشکلات پر قابو پانے کا ذریعہ بھی ہے۔ اُن کے مطابق موت بھی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ہر ایک جاندار کے لئے بیش بہا خزانہ ہے۔ مثلاً وہ زندگی سے متعلق اپنے کلیے کو یوں الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں:۔

زندگی ! تُو نے کیا دیا مجھ کو
ہنستے ہنستے رُلا دیا مجھ کو

ہے تیری خوشی سے مری زندگی
قیامت ترے روٹھ جانے سے ہے

زندگی اُس پہ مہرباں ہوگی
رنج و غم سے جو آشنا ہوگا

زندگی کی بس حقیقت ہے یہی
موت کی زد سے بچا کوئی نہیں

شاذ کی شاعری میں غم کے عناصر بھی جگہ جگہ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ زمانے نے اُنہیں زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ اُن کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے درد و الم کو دبانے میں کوشاں ہیں۔ لیکن یہ جذبہ ایسا ہوتا ہے کہ خود بخود آنکھوں سے بیان ہونے لگتا ہے۔ اسی لئے شاذ کی شاعری میں غم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں بے پناہ مصائب کا سامنا کیا ہے۔ یہ مصائب کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہو گئے ہیں لیکن وہ خنداں پیشانی سے ان مصائب کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنا راستہ تراشتے رہے۔ وہ کبھی اپنا غم غلط کرنے کیلئے زمانے سے بے

رخی اختیار کرنے لگتے ہیں اور کبھی اپنے آنسوؤں سے اپنے زخموں کو دھونے لگتے ہیں۔ کبھی آہ وزاری کرنے لگتے ہیں اور کبھی اقرار گناہ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں

کسی کا غم اٹھانا بھی ہے مشکل
اگرچہ بوجھ یہ بھاری نہیں ہے
غم حیات سے کس وقت ہم کنار نہ تھا
بشر مصائب وکلفت کا کب شکار نہ تھا
ہر رنج وغم کو نذرِ خرابات کریں گے
یوں دردِ دِل سے تلخیٔ حالات کریں گے
ہے غم ناک آنکھوں سے سب آشکار
نہ کچھ فائدہ غم چھپانے سے ہے

موجودہ دور پُر آشوب دور ہے۔ اس دور میں جو حالات بن رہے ہیں، وہ انسان کے لئے لمحہ فکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اخوت، بھائی چارہ، انسانیت، عالمی برادری، پیار اور محبت اب برائے نام رہ گئے ہیں۔ قدروں کی پامالی اور سماجی برائیوں کے فروغ نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ بدعنوانی، لوٹ کھسوٹ، قتل وغارت، ڈاکہ زنی آئے دن بڑھتی جارہی ہے۔ ایک حساس فنکاران تمام چیزوں کو کیسے برداشت کرسکتا ہے۔ وہ فقط اپنے قلم کو زباں دے کر لوگوں کو امن اور شانتی برقرار رکھنے کی تلقین کرسکتا ہے۔ شاذ کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں ایسے موضوعات ابھر کے سامنے آئے ہیں۔ جن سے سماجی بھلائی اور امن وآشتی کا پیغام ملتا ہے۔ مثلاً

عریانیت فریب ودغا، چاپلوسیاں
کیا کیا نہ آج شاملِ آداب ہوگیا

لیڈر کے دل کو چھید گیا ایک تیر طنز
کچھ کردکھانے کے لئے بے تاب ہوگیا

جو فصل بارود کی اُگی ہے
یہ رہبروں کی عناتیں ہیں

سرحدیں کہہ رہی ہیں انساں سے
کب یہ دیوار تم گراؤ گے

کھو گیا حرص وہوس میں آج کا انسان کیوں!
کوڑیوں کے دام اس کا بک گیا ایمان کیوں!

ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری ۱۹۹۰ء کے بعد ایک نئی سرحد میں داخل ہوئی۔ آگ اور خون کی ہولی نے شاعروں اور فنکاروں کو چند نئے پہلوؤں پر سوچنے کا موقعہ فراہم کیا۔ ایسے فن پارے سامنے آگے جن سے پڑھنے والے ایک نئی ڈگر پر کھڑے ہوگئے۔ ابھی تقسیم کے المیے کے نقوش دِل ودماغ میں چھائے ہوئے ہیں کہ بندوق اور بموں سے تباہی کا نیا منظر سامنے آگیا۔ بعض شعراء نے اس منظر کو اپنی پوری توانائی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اتارا اور موجودہ دور کا المیہ پیش کرنے سے گریز نہیں کیا لیکن بعض شعراء ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس درد کو کہیں اشاروں اور کنایوں میں اور کہیں براہِ راست قلم بند کرنے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ شاذ نے بھی ان موضوعات پر غور وخوض کیا ہے۔ اور کہیں کہیں ان جذبات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

انسانیت دشمن جو ہیں کب تک رہیں گے سماج میں
عزت سلامت رہ سکے قائم کچھ ایسا نظام کر

شاد پھر کشمیر میں ہے آمدِ فصل بہار
پُر سرور وکیف وادی کی فضا ہے دوستو

اُٹھے گی بفضل خدا کوئی موج
بچالے گی کشتی کو طوفان سے

یکسر مٹا ہی دیں گے دِلوں کی یہ دُوریاں
ہم دُور مذہبوں کے تفرقات

شاذ سلیس آسان اور عام فہم زبان استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ تو مشکل اور دشوار گذار تراکیب ملتی ہیں اور نہ گھسے پٹے خیالات۔ کہیں کہیں وہ خوبصورت تشبیہات اور استعارات استعمال کرتے ہیں اور کہیں ان کے علایم سے شعر ایک ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ پڑھنے والا ایک خاص قسم کی لطافت محسوس کرتا ہے۔ شاذ کی شاعری میں مصوری بھی ملتی ہے۔ وہ الفاظ سے ایسی تصاویر بناتے ہیں کہ ایک نیا منظر سامنے آجاتا ہے۔ بہر حال اگر وہ اپنی مشق سخن جاری رکھیں گے اور اسی محنت اور دلچسپی سے کام لیں گے تو ایک باصلاحیت شاعر کے طور پر اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کی اس شعری کاوش پر میں اُنہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

●●●

سوا نیزے پہ سورج

شیخ خالد کرار کا نام نئے شعرا کی فہرست میں نمایاں طور پر شامل کرنے کے لائق ہے اگرچہ اُن کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن وہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلوں کو طے کرتے گئے اور اپنی محنت لگن اور بے پناہ صلاحیت سے اپنی شاعری میں نئے نئے رنگ بھرتے رہے۔ عالمی برادری، اخوت، پیار، محبت، خلوص اور جذبۂ ایثار اُن کی عزیز ترین موضوعات ہیں لیکن ان موضوعات کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری میں انسانی زندگی کے گوناگوں تجربات بھی ملتے ہیں۔ یہ تجربات ان کے الفاظ اور تراکیب میں ڈھل کر ذہن کے دروازے وا کرتے ہیں اور قاری کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تجربے، وجدان، انکشاف اور ادراک کے قائل ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں وہ واضح نظریہ رکھتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''شاعری میرے تجربات ومشاہدات کی دنیا میں ہونے والی اُتھل اپتھل میری داخلی شکست وریخت اور خارجی سطح پر

ہونے والی کئی طرح کے بدلاؤ کی مظہر ہے۔''

غزل، خالد کرار کی عزیز ترین صفِ سخن ہے اس صنف میں بھی اُن کے گوناگوں تجربات ملتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی پوری قوت سے نظم نگاری کے میدان میں بھی قلم آزمار ہے ہیں اور نت نئے تجربات سے اس میدان کو زرخیز بنانے کی کوشش کررہے ہیں لیکن وہ نظم سے زیادہ غزل کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی ایک غزل میں اس بات کا احساس یوں دلاتے ہیں:۔

حرفِ تازہ کہ مری اور چلا آتا ہے
پھر وہ سجدے کہ مری اور چلا آتا ہے

اپنے ایک اور شعر میں اس بات کا احساس یوں دلاتے ہیں:۔

کبھی کبھی تو دِنوں میں کتاب ہوجاوے
کبھی تو شعر کوئی سال بھر میں آوے ہے

خالد کی شاعری عصرِ حاضر کی شاعری ہے۔ اس میں حسن بھی ہے اور نزاکت بھی درد بھی ہے اور تاثیر بھی، لطافت بھی ہے اور چاشنی بھی۔ یہ تمام چیزیں ان کے تجربات میں ڈھل کر ان کی شاعری میں تازگی اور توانائی پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں ڈرامائی عناصر اُبھرتے ہیں۔ وہ نہ صرف خود کردار بن کر سامنے آتے ہیں بلکہ اپنے خیالات سے بھی قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس میں اُن کے ذاتی تجربے بھی شامل ہیں اور انسانی زندگی کے مسائل بھی۔ اُن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں بعض ایسے کردار سامنے آتے ہیں جو بڑی خوش اسلوبی سے اپنا رول نبھا کر خالد کی شاعری میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ مثلاً چند اشعار

تمہارے خواب کی تعمیر میں رہا مشغول
میں سوچتا تھا مجھے دیکھا بدن میرا ہے

وہ آج چپ ہے تو ایسا نہیں کہ اس نے بھی
سجا ہوا کبھی نیزے پہ سر نہیں دیکھا

خالد سچے اور مخلص شاعر ہیں۔ان کے ہاں درد بھی ہے اور کسک بھی۔ یہی چیز ان کی شاعری کو حیاتِ جاودانی بخشتی ہے۔ اس دور کے مسائل ابھارنے میں خالد کی شاعری ثابت قدم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعران مسائل کو اُجاگر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں میں گھسے پٹے اور فرسودہ خیالات کی سوزن کاری نہیں ملتی ہے بلکہ اُس کے بدلے نئے امکانات کی بازیافت ہوتی ہے۔ان کا لہجہ نرم اور ملائم ہے لیکن کبھی کبھی یہ لطیف طنزیہ پیرایہ بھی اختیار کرتا ہے۔اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں حقیقت آمیزی کے ساتھ ساتھ طنزیہ پیرایہ بھی ملتا ہے۔ کہتے ہیں:۔

میزائل، جنگ، سرحد، خوف، توپیں
لہو ، لاشیں، زمیں، شمشاں، پتھر

کم شناس دریا سے دوستی نہیں کرتا
میں کہ کچھ سمندر کا بھی خیال رکھتا ہوں

پرکھوں کی کہانی میں یہ کردار نہیں تھا
سردرد تھے سب کوئی سردار نہیں تھا

خالد زبان کی تازہ کاری کا بھی سلیقہ رکھتے ہیں۔اُن کے یہاں احساس کی شدت ہے بے ساختہ پن، حسن اور معنی آفرینی ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔اُن کے ہاں غم جاناں اور غم دوراں کے ساتھ ساتھ عصری آگہی کا عرفان بھی ملتا ہے۔جو ان کی شاعری کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔غزل میں وہ مختصر بحور کا استعمال کرتے ہیں اور بڑی سی بڑی بات مختصر الفاظ میں بیان کرنے کا گُر رکھتے ہیں۔

خالد اگر چہ نئے شاعر ہیں لیکن اُن کے ہاں کلاسیکی شاعری کا بھرپور احساس ہے انہوں نے غالب، میر، اقبال اور فیض کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور نئے اور جدید شعراء کے کلام

سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں۔اسی لئے اُن کی شاعری میں فکر کی تازگی اور فن کی بھرپور نزاکت کا احساس ہوتا ہے۔ایک جگہ اپنے خیالات کو یوں زبان دیتے ہیں:۔

مرا سخن مرے معنی کی قید سے بالا
کھلیں گے حرف مرے تازہ لفظیات کے بعد
فسوں سے ماوراں ہوں، چشم تر سے آگے ہوں
پس فریب نفس، بام ودر سے آگے ہوں

خالد کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں بھی توجہ طلب ہیں۔ان میں بھی شاعر کی زندگی کے گوناگوں تجربے شدت کے ساتھ ملتے ہیں۔

خالد کرار کے شعری مجموعے 'سوا نیزے پہ سورج' میں ان کی چند نظمیں بھی ملتی ہیں۔ جن میں اُن کی غزلوں کی طرح فکروخیال کی بلندی پائی جاتی ہے۔کشمیر، دسمبر، دوسرا رُخ، سیدھی بات، انتہا جنگل سے جنگل کی طرف، ایمان، تلاش اور خواب، جیسی نظمیں اپنا ایک انفرادی انداز رکھتی ہیں۔ان نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر اپنی بات کہنے کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔اُن کی چند نظمیں پیش خدمت ہیں جو غور فکر کی دعوت دیتی ہیں۔مثلاً

ے دادی اماں کے مرنے پر
ترکے کی جب چھان پھٹک کی
ایک پھٹیچر بکسے میں سے
ایک پرانے بستے میں سے
ایک پرانا قلمی نسخہ
ایک صحیفے کا نکلا تھا
کپڑے کی اک تھیلی میں سے
چاندی کا سکہ نکلا تھا۔ (دوسرا رُخ)

مسجدیں، مسجدیں، ہی ہر جانب ے
مسجدیں، ہر گلی محلے میں
چوک ونکڑ میں گنبد و محراب
مسجدیں اور مسجدوں میں بھیڑ
خوب قد کاٹھ کے نمازی بھی
لمبے چغے، اونچی دستاریں
خوبرو چہرے، تابناک آنکھیں
مسجدیں ہر گلی محلے میں

______ (ایمان)

خالد کی بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں انسانی زندگی کے گونا گوں تجربات ملتے ہیں۔ یہ نظمیں آزاد بھی ہیں اور پابند بھی۔ ان نظموں کے لفظیات پر غور کیا جائے تو بہت ساری گرہیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شاعر لفظ و معنی کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ ایک لفظ کو نئے معنوں میں پرونا اور پھر تجربات کو فن کی بھٹی میں تپا کر کندن بنانا کتنا دشوار گذار عمل ہے۔ خالد نے اس عمل سے گذر کر اپنی نظموں میں اپنے لفظیات سے حرکت و حرارت دی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی نظمیں خواب، تلاش، ایمان وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن میں معنی آفریں بھی ہے اور تازگی اور توانائی بھی۔

دسمبر ہے دسمبر اور کشمیر خالد کرار کے فن کے دو نمونے ہیں جن میں فنکار کی حقیقی زندگی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان نظموں سے وادی کشمیر کی خوشبو آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کانگڑی، زعفرانی تتلیاں، برف جیسے علائم اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ اپنے مادرِ وطن کے اُس گوشے سے کتنا پیار کرتے ہیں جس کو ۱۹۹۰ء میں بعض شر پسند عناصر نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے برباد کردیا۔ اس پر خالد بھی ایک سچے اور حقیقی فنکار کی طرح آنسو بہاتے ہیں۔ وہ کشمیر میں امن و امان کے خواہاں ہیں اور اپنے خوشبودار الفاظ سے وہ اپنی تخلیقات

میں ایک نیا ذائقہ پیدا کرتے ہیں۔ البتہ تیغ و خنجر، قرین شہ رگ، منکشف، العطش، خود گرایدہ، مشکیزۂ جاں وغیرہ جیسے الفاظ وتراکیب استعمال کرنے سے کہیں کہیں اُن کی شاعرانہ انفرادیت مجروح ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کی شاعری میں مجموعی طور پر اپنا ایک الگ رنگ قائم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے نام کا درد بھی نظر آتا ہے۔ اور یہی اُن کی پہچان ہے!!

●●●

سرگوشیاں

برج ناتھ بیتاب نہ صرف ایک براڈ کاسٹر کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں بلکہ وہ کشمیری زبان کے ایک باصلاحیت شاعر کے طور پر بھی دنیائے ادب سے متعارف ہیں۔ وہ ہندی میں بھی لکھتے ہیں اور اپنے گوناگوں خیالات کو صفحہ قرطاس پر اُتارتے ہیں۔ کشمیری ان کی مادری زبان ہے اور اردو سے انہیں والہانہ عشق ہے۔ اُنہوں نے کشمیری شعراء پر بعض جاندار مقالات بھی لکھے ہیں اور یہ مقالات وہ وقتاً فوقتاً مختلف علمی و ادبی تقاریب میں پیش کر کے داد بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ''سرگوشیاں'' اُن کا تازہ ترین اردو شعری مجموعہ ہے جس میں اُن کی بے عنوان نظمیں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ 2011ء میں جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے مالی امداد سے شائع ہوا ہے اور قارئین سے داد حاصل کر چکا ہے۔ ''سرگوشیاں'' کا سرورق دیدہ زیب ہے اور یہ کشمیر کے معروف آرٹسٹ ویر منشی کی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہے اور وادیٔ کشمیر کی یاد تازہ کرتا ہے جو بیتاب کی جنم بھومی ہے اور راقم السطور کی بھی۔

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ (۱) کشمیر کی نظمیں (۲) ہماری نظمیں (۳) دِلّی کی نظمیں۔ بیتاب ان بے عنوان نظموں کا محرک کشمیر کے 1990ء کے حالات بتاتے ہیں۔ چنانچہ ''سرگوشیاں'' کے سرنامہ میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میری نظمیں بے عنوان ہیں کیونکہ میری بے ثمر راتیں کبھی کشمیر کی

نظمیں بن گئی ہیں۔ تو میرے رتجگے دلی کی نظموں کی شکل میں تاریخ کا مرثیہ بن گئے ہیں۔ میری ہجرت، محرومی، بے سروسامانی، بے گھری، میری بے بسی اور میری بے سمت ساختوں نے "تمہاری" نظموں کا روپ دھار لیا ہے۔ اپنی نظمیں اس لئے اپنی نہیں کہ ان کے سبب دل میں بھی کسی اور کی دھڑکنیں رقصاں ہیں۔ ان خون آلود ٹوٹتے، بکھرتے رشتوں کو عنوان آپ دیجئے پہچان آپ دیجئے۔ میں صرف ایک تماشائی کی شکل میں اپنا تماشا خود دیکھ رہا ہوں"۔

بیتاب گذشتہ 22 برس سے ہجرت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ وہ اپنی جنم بھومی سے دور دلی کی تیز رفتار زندگی کی خاک چھان رہے ہیں۔ اپنی مٹی سے کٹ جانے سے وہ اجنبی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ماحول کلچر تہذیب وتمدن اور زبان سے دور ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں میں ہجرت کا درد اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اُن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں لہٰذا وہ 22 برسوں کی جدائی کا زہر الفاظ کی صورت میں اگلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ان حالات نے ہمارے مشترکہ کلچر پر شب خون مارا ہے اور ہمیں وطن میں اجنبی بنا دیا ہے۔ وہ تتلی، مور، مچھلی اور پانی جیسی علائم کے ذریعے سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ نامساعد حالات ہمارے مشترکہ کلچر تہذیب اور تمدن پر گہرے طور پر اثر انداز ہوئے

تتلی کے پنکھ مور نے لگائے
تتلی زندہ ہے ناچ مر گیا
پہلے مچھلی مر جایا کرتی تھی بغیر پانی کے
اب کے پانی مرا ہے بغیر مچھلی کے
1990 کا یہ سال
برسات لے کر آئے گا

یہ اس سرزمین کی کہانی ہے جس کو لوگ لل دید اور نند رشی کی تپسیا کہتے تھے جہاں رسول میر اور حبہ خاتون کے نغمے گونجتے تھے۔ اور جہاں پرمانند اور کرشن جو رازدان نے بھکتی کے گیت گاتے تھے۔

بیتاب ان واقعات سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ اُنہوں نے اپنے قلم کو زبان دی اور اپنی اوّلین

فرصت میں اپنی کتاب میں یہ خونین واقعات درج کیے۔ وہ سنجیدگی سے اس معاملے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اگر سرحد نہ ہوتی تو یہ جھگڑے بھی نہ ہوتے۔ ایک اور نظم میں اس بات کا احاطہ یوں کرتے ہیں۔

کون کس سے لڑے گا
اگر یہ سرحدیں نہیں رہیں گی
میں سوچتا تھا
ایک ٹکڑا آسمان تم لے گئے تھے
ایک ٹکڑا آنگن میرے پاس بچا تھا۔
پہلے تم نے مجھے اور خود کو بانٹ دیا
پھر اسی دیوار نے
ایک ہی سورج کو دھوپ اور سائے میں کاٹ دیا
اور روشنی کا قتل ہوا

بیتاب کی یہ نظم معنی خیز ہے۔ اُنہوں نے بڑی گہری اور سنجیدہ بات کہی ہے۔ وہ کبھی براہ راست اپنی بات کہنے پر مصر ہیں اور کبھی علامتوں اور اشاروں سے کچھ ایسے سوالات ابھارتے ہیں کہ قائل ہونا پڑتا ہے۔

صرف یہیں پر کہانی ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ کہانی بہت طویل ہے۔ ایک جگہ اپنے خیالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

بادلوں کے اُس پار
لال گھوڑے پر سوار
جب میرا سورج اوجھل ہو جاتا ہے
رات شروع ہو جاتی ہے
زندگی میں، دکھ کی ہر بات شروع ہو جاتی ہے
رات کا ہر لمحہ مجھ پر بھاری ہو جاتا ہے
خواب تمہارا، جب پلکوں پر طاری ہو جاتا ہے

خوابیدہ آنکھوں سے نینداوجھل ہو جاتی ہے

''تمہاری نظمیں'' کے زیرِ عنوان بیتاب کے شعری مجموعے ''سرگوشیاں'' میں جو نظمیں نظر نواز ہوتی ہیں، وہ بہت ہی عمدہ اور ان کا بے باک شعری اظہار ہے۔ یہ ایک عاشق کی سرگذشت ہے جو اپنے محبوب کا تعاقب کر کے اپنی اصلی منزل بھول جاتا ہے۔ کبھی وہ انجان راہوں پر بھٹکنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کبھی اُنہیں سرابوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ خاموشیوں سے اپنی مسافت طے کرتا ہے اور کبھی دشت زار پر چلتے چلتے نئی نئی منزلوں کو سر کرتا ہے۔ دیکھئے ایک جگہ اپنی بے پناہ محبت کا احساس کس طرح سے دلاتا ہیں:

لمحے بھٹک جاتے ہیں
وقت راستہ بھول جاتا ہے۔ جب تم
پاس سے گزرتی ہو
زندگی کے صحراؤں میں یادوں کے نشان
ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تعاقب کرتا ہوں

احساس کی کچی دیواروں پر
جذبات کی یہ بوچھاریں
پیش خیمہ ہیں جانے کس منظر کا؟
ایک اجڑے پن کا تصور
دلہن کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی طرح
شروع شروع میں کتنا چمکیلا لگتا ہے

دلی کی نظمیں ''سرگوشیاں'' کا تیسرا حصہ ہے۔ اس حصے میں بیتاب نے دلی کے کلچر تہذیب و تمدن، آثار قدیمہ، رہن سہن، کشمیر سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی سرگرمیوں پر یہاں کے ماحول کے اثرات کا منظوم خلاصہ بڑے بچے تلے انداز میں پیش کیا ہے۔ دریا گنج کے فٹ پاتھ، پرانی دلی، جنتر منتر، خونی دروازہ، برلا مندر اور گول مارکیٹ وغیرہ جیسے مقامات اُن کے روم روم میں سمائے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ یہ مقامات جو دلی کی شان ہیں اور جن کی بے شمار یادیں، انسان کے دل میں منقش ہیں۔ بیتاب

اپنے دل میں ان یادوں کے چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ دلی کی تباہ کاریوں کا ذکر مختلف علائم اور استعاروں سے کرتے ہیں۔ دیکھئے اپنی اس نظم میں کیا کہتے ہیں

تاریخ کی چشم دید جمنا
کثافت سے اتنی بگڑ گئی ہے
کہ دلی سے زیادہ اجڑ گئی ہے
اجڑے ہوئے اس دیار میں ہم
زندگی کے لئے تھوڑے سے پیار ہیں ہم
زندگی کو بوتلوں میں بیچتے ہیں

دلی میرے شہر میں
غیر ملکی حکمرانوں کا مزاج
آدھی شہنشاہی ہے
ہر سمت موت کا سایہ ہے
جہاں دیکھئے پڑوسی پرایا ہے
زندگی اس قدر لاچار و مجبور ہے
کہ ہر شخص یہاں ایک مزدور ہے!!

برج ناتھ بیتاب کی زبان صاف اور شستہ ہے۔ اس میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی۔ ان کے خیالات پختہ ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے سے انسان کی تاریخ کا نئے سرے سے جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعے سے بعض ایسے مسائل قارئین کے سامنے لاتے ہیں جو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مشاہیرادب کے تاثرات

- **پروفیسر آل احمد سرور (اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سرینگر کشمیر)**

مجھے اس بات سے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ سبھاش چندر رایمہ (پریمی رومانی) نے میری نگرانی میں "جدید اُردو شاعر اور اقبال" کے موضوع پر قابل قدر اور معیاری کام کیا ہے۔ وہ ایک محنتی اور ہونہار اسکالر ہیں۔ اس تحقیقی کام کی تکمیل پر میں اُنہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۵/دسمبر ۱۹۸۴ء

- **پروفیسر مسعود حسین خان (علی گڑھ)**

پریمی رومانی کے اسلوب میں ایک خاص قسم کی شگفتگی ہے، جو اس لئے تعجب خیز ہے کہ اُردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ اُن کا قدم خوب سے خوب تر کی جانب اُٹھ رہا ہے۔ اگر وہ اسی طرح ترقی کرتے رہے اور اپنے مخصوص میدان تنقید یعنی جدید اُردو شاعری سے باہر نہ بھٹکے تو یقیناً کچھ عرصہ کے بعد اُردو ادب میں اُن کی آواز غور سے سنی جائے گی۔

- **احمد ندیم قاسمی (لاہور)**

"برج پریمی ...... ایک مطالعہ" آپ کے عنایت نامے سمیت ملے۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنے والد گرامی کی شخصیت اور ادبی کاوشوں کو کتابی صورت میں سمیٹ لیا۔ اب مرحوم برج پریمی صحیح معنوں میں تاریخ اُردو ادب کا ایک ناگزیر حصہ بن گئے ہیں۔

• پروفیسر گوپی چندر نارنگ (نئی دہلی)

آپ کی کتاب "اقبال او، جدید اُردو شاعری" موصول ہوئی۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ بہت ہی مشکل موضوع ہے لیکن آپ نے اس کا حق ادا کرنے کا پوری سعی کی ہے اور آپ سے اسی کی توقع تھی۔ آپ نے اپنے والد محترم کی علمی روایت کو زندہ رکھا، جس کے لئے دِل سے دُعا نکلتی ہے۔

۲۰ر جولائی ۲۰۰۵ء

• پروفیسر عالم خوندمیری (حیدر آباد)

پریمی رومانی نئی اُردو شاعری کے مزاج سے آشنا ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق و امتیاز سے واقف ہیں۔

• پروفیسر قمر رئیس (نئی دہلی)

پریمی رومانی اپنے خونِ جگر سے اس چراغ کو جلائے ہوئے ہیں اور وطن سے ہجرت کے تلخ حالات میں بھی علمی و ادبی کام کر رہے ہیں۔

• پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں)

یہ کہنا پریمی رومانی اُردو زبان و ادب سے محبت کرتے ہیں صورتِ حال کو واضح نہیں کرتا۔ صحیح صورتِ حال یہ کہنے سے واضح ہوتی ہے کہ پریمی رومانی کو اُردو زبان و ادب سے عشق ہے، بے پایاں عشق۔ اور یہ بے پایاں عشق اُنہیں اپنے والد محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی سے وراثت میں ملا ہے۔ جو اُردو کے ایک مسلمہ حیثیت کے نقاد، معتبر محقق اور باخبر اُستاد تھے۔ اقبال کے فکر و فن کا اثر قبول کرنے والے شعراء کے کلام کا جس طرح پریمی رومانی نے تجزیہ کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے۔

(تعمیر فکر۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۲۰۰۳ء)

• قمر جلال آبادی (ممبئی)

پریمی رومانی معیاری شاعری کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ پریمی رومانی رنگ ٹیٹگ، عالی

کدل، سری نگر کشمیر میں ایک ممتاز ادیب ڈاکٹر برج پریمی کے ہاں پیدا ہوئے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو یہ باتیں یاد نہیں رہیں گی، آپ کو یاد رہیں گے صرف ان کے پسندیدہ شعراور ان شعروں کی وجہ سے آپ کو اُن کا نام بھی یاد رہے گا یہی ان کی مقبولیت اور کامیابی کی ضمانت ہے۔

(۱۰ر جولائی ۱۹۹۱ء)

● پروفیسر عنوان چشتی (نئی دہلی)

پریمی رومانی کو ذوقِ ادب ورثے میں ملا ہے۔ اُنہوں نے اس دین میں اپنے مطالعے اور مشاہدے سے بیش بہا اضافہ کیا۔ موصوف کی یوں تو کئی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں لیکن تاثرات میں پریمی رومانی ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ تاثرات میں اگرچہ تنقیدی مقالوں کے ساتھ ساتھ موصوف کے تبصرے بھی شامل ہیں مگر تبصروں میں بھی وہی تنقیدی نگاہ جلوہ فرما ہے، جو اُن کے مقالوں میں ہے۔ اس لئے اُن کے تبصرے بھی مقالوں کی طرح تنقیدی بصیرت کے حامل ہوتے ہیں۔

(۱۴ر جنوری ۱۹۹۸ء)

● پروفیسر حامدی کاشمیری (سرینگر)

پریمی رومانی اُردو شاعری خاص کر نئی اُردو شاعری کے ایک محنتی ہوش مند اور حساس طالب علم ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب میں چند نمائندہ نئے شعراء کے معروضی اور تفصیلی مطالعے کی طرف توجہ دی ہے، مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اپنے معاصرین پر قلم اٹھاتے ہوئے ایک ناقد کے لئے جو غیر جانبدارانہ رویہ جرأت مندی اور تاثر پذیری ناگزیر ہے۔ پریمی رومانی نے اس کا حق ادا کیا ہے۔ یہ امر بھی باعث طمانیت ہے کہ نئے شعراء پر اس نوع کا یعنی انفرادی شعراء کا مطالعہ پہلی بار اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ اہل نظر رومانی کی کاوش اور ہمت کی داد دیں گے۔

(جدید اُردو شاعری چند مطالعے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی)

● مخمور سعیدی (نئی دہلی)

ڈاکٹر پریمی رومانی اُردو کے مشہور ناقد اور شاعر ہیں۔ وہ کشمیری ہیں اور اُردو کے ساتھ ساتھ

کشمیری زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ پیش رفت ان کے مضامین کا مجموعہ ہے اور اقبال، ٹیگور، جوش ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد اور ہر چرن چاولہ کو چھوڑ کر اُنہوں نے زیادہ تر اُن ادیبوں اور شاعروں پر قلم اُٹھایا ہے جن کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے اور جن پر اب تک ہماری تنقید نے وہ توجہ نہیں کی، جس کی وہ مستحق ہیں۔

(ماہنامہ اُردو دُنیا، دہلی)

● مظہر امام (دہلی)

ا۔تمہاری تازہ کتاب تاثرات کل ملی، کئی مضامین پڑھ گیا۔ بڑی محنت سے لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ بہت خوشی ہوئی کہ تم اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہو اور تم نے لکھنے پڑھنے کو عبادت کا درجہ دے رکھا ہے۔

اا۔ پریمی رومانی ایک نوجوان شاعر اور ناقد نہیں۔ شاعر ہونے کی وجہ سے اُنہیں شاعروں کے مطالعے میں آسانی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے شاعروں کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھا ہے۔ شاعر کے نظریات اور اس کی شاعری کے خصوصی اوصاف تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے شاعروں کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھا ہے۔ پریمی رومانی میں جدید شاعری کے مطالعے کی ایک لگن ہے۔ان کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔لیکن ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

(اوراق۔ڈاکٹر پریمی رومانی ۱۹۸۷ء)

● پروفیسر محمود ہاشمی (لندن)

آپ کی کتاب ''تاثرات'' میں نے غور سے پڑھی۔سب سے پہلے میں نے ''بلبل کاشمیری۔شخص اور شاعر'' پڑھا اور آپ کی تنقیدی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مضمون کے صفحہ نمبر ۵۴ پر دیئے ہوئے فٹ نوٹ سے آپ کی تحقیقی تگ ودو کا بھی قائل ہوا۔

اپنی کتاب میں آپ نے جہاں سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، اثر صہبائی، قتیل شفائی، عنوان چشتی، منشی پریم چند اور کرشن چندر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ اُردو ادب پر حاوی ہیں اور اس حوالے سے آپ کی نظر بڑی دور بین ہے، وہاں آپ نے ریاست کے گنج ہائے گراں مایہ کا تعارف اور اُن کے کام کی پہچان میں بھی بڑی محنت اور محبت سے کام لیا ہے

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد)

ڈاکٹر پریمی رومانی ادھر نئے لکھنے والوں میں خاصے جانے پہچانے جاتے ہیں۔اُن کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جدید اُردو شاعری، چند مطالعے، اوراق، ردعمل، تاثرات برج پریمی۔ایک مطالعہ و نیز شاعری میں سنگ میل اور ان کے علاوہ کشمیری میں دو کتابیں۔اُنہوں نے تحقیق اور تنقید دونوں سمت توجہ دی ہے اور دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ڈاکٹر پریمی رومانی کے مطالعہ کی وسعت اور شعروادب کے مختلف گوشوں پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد اگست ۲۰۰۳ء)

عرش صہبائی (جموں)

پریمی رومانی کے کلام میں جہاں زندگی کے مختلف تلخ تجربات کی چھاپ ملتی ہے وہیں پختگی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ پریمی رومانی کا کلام صحت مندر جحانات کا آئینہ دار ہے اور زندگی کے بہت قریب بھی۔ اسی لئے وہ دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ (سنگ میل از ڈاکٹر پریمی رومانی)

شیخ غلام علی بلبل کاشمیری (لندن)

میں آپ کی بے پناہ محبت کاوش اور تحقیق کی داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا۔

وید راہی (ممبئی)

حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ جموں میں گوشہ نشین ہو کر اتنے اعلیٰ اور معیاری ادب کی تخلیق و اشاعت میں مصروف ہیں۔ میں اس بات نے خاص طور پر متاثر ہوا ہوں کہ اپنے پسندیدہ شعراء کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ اپنی علمیت یا ادبیت کا رعب دار مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ انہیں سمجھنے سمجھانے کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہیں ۔اس طرح سے آپ ایک نیچرل عمل میں سے گزرتے ہیں اور تہہ در تہہ چھپے ہوئے معانی کی نئی نئی دُنیا اُجاگر کرتے جاتے ہیں۔آپ کی گہری نقد و نظر اور مخلصانہ رویے کی داد دینی پڑے گی۔

حکیم منظور (دہلی)

ڈاکٹر پریمی رومانی میرے مرحوم دوست ڈاکٹر برج پریمی کے صاحبزادے ہیں۔ اُردو زبان وادب سے اس کشمیری پنڈت گھرانے کی وابستگی مثالی ہے، لہٰذا قابل تعریف ہے۔ پریمی کا رجحان طبع اپنے والد کی طرح تنقید کی جانب مائل ہے۔ اُن کے تنقیدی مضامین کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ اپنے اس تنقیدی شعور کے حوالے سے پریمی نے شعر گوئی میں اپنی راہ متعین کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ پریمی نے نہ صرف زندگی کی تلخیوں کو بھوگا ہے بلکہ اُن کو اپنی راہ کی روشنی بھی بنایا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری میں یاس پر آس کا غلبہ ہے۔ جو ایک مثبت روئے کی نشاندہی کرتا ہے۔

۲راپریل ۲۰۰۱ء

پروفیسر منظر اعظمی (جموں)

پریمی رومانی جموں و کشمیر کے ایک باصلاحیت ادیب ہیں۔ وہ ایک بڑے ادیب باپ کے بیٹے ہیں ۔ادب سے شغف انہیں ورثے میں ملا ہے .... وہ بڑے مرنجان مرنج، غیر متعصب اور غیر جانبدار اہل قلم ہیں۔ اس خصوصیت نے انہیں مختلف مکتبۂ فکر کے شاعروں اور ادیبوں کے کمال فن کو پرکھنے اور اُن کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں مدد دی۔

زبیر رضوی (نئی دہلی)

پریمی رومانی کے تنقیدی رویے اور احتساب کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئی تنقید جسے سلیم احمد، شمس الرحمٰن فاروقی، باقر مہدی، وارث علوی اور وحید اختر نے فروغ دیا، اس کے گرویدہ نظر آتے ہیں.......... اُن میں پرکھنے اور پھر اپنی پرکھ کی روشنی میں فیصلہ دینے کی ہمت پیدا ہو چکی ہے اور یہ بھی کم اہم نہیں۔

(۴راگست ۱۹۸۰ء)

پدم شری موتی لال ساقی (جموں)

نئی نسل کے لکھنے والوں میں پریمی رومانی کا نام توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔ پریمی نے اپنا ادبی سفر ایک شاعر کے طور پر شروع کیا مگر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ آپ کی ادبی سرگرمیوں کا دائرہ کار کشادہ

ہوتا گیا۔ادب کے ساتھ پریمی کی وابستگی صرف کاروبار شوق تک محدود نہیں بلکہ ادب اس کے لئے ایک ہمہ وقت موضوع ہوگیا۔ اپنے والد کی تحریروں کو شائع کرنے میں آپ نے جس سرگرمی اور انہماک کا مظاہرہ کیا۔ اُسے دیکھتے ہوئے ہر لکھنے والا تمنا کرے گا کہ اسے بھی پریمی رومانی جیسا بیٹا نصیب ہو۔

(تاثرات۔ایک جائزہ)

- ڈاکٹر صاحب علی (ممبئی)

پریمی رومانی شاعر ہیں لہٰذا اِن کی نثر بڑی دِلکش ہے۔ان کی تحریروں کی زبان آسان اور بیان واضح ہوتا ہے۔مگر وہ اختصار کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔طرز استدلالی اختیار کرتے ہیں لہٰذا اُن کے خیالات سے انحراف کرنا آسان نہیں ہوتا۔

- ڈاکٹر رئیس احمد (دہلی)

ڈاکٹر پریمی رومانی کا اصلی نام سبھاش چندر رایمہ ہے لیکن موصوف علمی وادبی دُنیا میں اپنے قلمی نام سے ہی مشہور ومعروف ہیں۔آپ ڈاکٹر برج پریمی (مرحوم) کے فرزند ارجمند ہیں جو اپنے زمانے کی ایک اہم علمی وادبی شخصیت تھے۔پریمی رومانی نے میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز کے تحت نہ صرف باپ کا علم ہی حاصل کیا بلکہ اسے اپنی زندگی کا ایک حصہ بنالیا۔مصنف کی تحقیقی وتنقیدی نوعیت کی پندرہ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔جن میں جدید اُردو شاعری اوراق، تحریر وتقریر، ردِعمل اور تاثرات کے علاوہ برج پریمی۔شخصیت اور فن، ناقدین ادب سے داد وتحسین حاصل کرچکی ہے۔

اقبال اور جدید اُردو شاعری کو بھی اپنے موضوع پر ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہے اس کتاب میں علامہ اقبال کے عہد وزماں، فکروفن اور معاصرین اقبال پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے...........مزید برآں مصنف کے دلکش اسلوب بیان اور منطقی واستدلالی طرز بیان نے اس کتاب کی ادبی اہمیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔جس کے لئے پریمی رومانی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

- ارجن دیو مجبور (جموں)

ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان اُردو ہے۔یہاں اُردو جاننے والے لاکھوں کی تعداد میں

موجود ہیں۔ اگر چہ انگلش میڈیم سکولوں کی مہربانی سے اُردو کی جڑیں کمزور ہورہی ہیں لیکن کچھ اُردو ادیبوں کی بدولت اس زبان کے سرمائے میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایسے ادباء میں پریمی رومانی کا نام پیش پیش ہے جنہوں نے اُردو کو زندہ رکھنے اور اس کے ادب کو فروغ دینے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے۔

مشاہیرِ ادب کے خطوط

ــــــ برج پریمی کے نام

(مرتبہ)

ڈاکٹر پریمی رومانی

آنجہانی برج پریمی کا شہرہ منٹوشناسی کے لئے اُردو دُنیا میں قایم ودایم ہے۔ منٹو پر ایسا تحقیقی کام، منٹویات میں کسی بھی نام نہاد منٹوشناس نے نہیں کیا ہے جبکہ درس وتدریس سے وابستہ برج پریمی نے منٹو ایسے نابغہ تجربہ پسند افسانہ نگار کی شخصیت اور فن پر غیر معمولی تحقیقی کام کیا ہے۔ بقول اوپندر ناتھ اشکؔ

"منٹو پر تمہارا (برج پریمی کا) مقالہ لاجواب ہے۔ تمہاری تحقیق کی داد دیتا ہوں۔ تم نے بہت کارآمد مسالہ منٹو کے چاہنے والوں اور ریسرچ اسکالروں کے لئے فراہم کیا ہے۔ میری مبارکباد قبول کرو۔"

۶۶ مشاہیر ادب کے مکاتیب کا دیدہ زیب مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔

اس مجموعے میں: منٹو کے درجہ ذیل معاصرین کے خطوط شامل ہیں

ابوسعید قریشی، احمد ندیم قاسمی، اعجاز صدیقی، اُوپندر ناتھ اشک، پریم ناتھ بزاز، گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، حبیب کیفوی، خواجہ احمد فاروقی، ظفر پیامی، سلام مچھلی شہری، سہیل عظیم آبادی، سردار دیوان سنگھ مفتون، صفیہ منٹو، ضیا عظیم آبادی، عبدالقادر سروری، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، قرۃ العین حیدر، کشمیری لال ذاکر، گیان چند جین، مجروح سلطانپوری، مسعود حسن خان، مغنی تبسم، کوثر چاندپوری، محمد یوسف ٹینگ، نعیم صدیقی، وزیر آغا، خواجہ احمد فاروقی، قمر رئیس، محمد امین ظفر، لطیف کاشمیری، عنوان چشتی وغیرہ۔

ضخامت: ۲۴۸ صفحات

قیمت: ۵۰۰ روپئے سنہ اشاعت: ۲۰۱۰ء

تقسیم کار

رچنا پبلی کیشنز

۳/ انصیب نگر، جانی پور۔ جموں ۱۸۰۰۰۷ (توی)